97

عبداللہ بن سبا

مؤلفہ

جناب عمدۃ المحققین سید منظور حسین صاحب بخاری

مؤلف 'توثیق فدک' 'اسلام کا تاریک دور'

اجنالہ، سرگودھا

ناشر

مکتبۃ الناصر بیرون شاہ عالمی دروازہ، سرکلر روڈ، لاہور

تعداد :- ایک ہزار

قیمت :- تین روپے پچاس پیسے

ناشر :- مکتبۃ الناصر، بیرون شاہ عالمی دروازہ، سرکلر روڈ، لاہور

مطبوعہ :- نقوش پریس لاہور، اردو بازار۔

فہرست

تقریظ

از عالی جناب حجۃ الاسلام مولانا حسین بخش صاحب قبلہ مدیر سرپرست جامعہ علمیہ باب النجف جاڑا ضلع ڈیرہ اسماعیل خان

"اثنائے قیام جامع 'المنتظر' لاہور صانہ اللہ کتاب موسوم "عبداللہ بن سباء" کے مسودہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کتاب کے فاضل مصنف مولانا سید منظور حسین صاحب نقوی نے مجھ سے اپنے حسنِ عقیدت کے پیشِ نظر کتاب پر تبصرہ و تقریظ کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ اگرچہ مجھے تدریسی امور کے ساتھ ساتھ تفسیر قرآن مجید انوار النجف کے لئے کافی وقت طلب مطالعہ کی ضرورت تھی، اور علاوہ ازیں کتاب "دین و اسلام" کا ترجمہ بھی انہی ایام میں میرے عہدہ میں داخل تھا۔ اور دریں حالات میرے لئے کتابِ مذکور پر استقصائی عبور نہایت دشوار تھا تاہم میں نے کتابِ مذکور کو کافی حد تک دیکھا۔

فاضل مصنف نے نہایت محققانہ انداز میں کافی کد و کاوش سے مطالبِ انیقہ و مقاصدِ شریفہ کو جمع فرما کر عبداللہ بن سبار کے فتنہ کو اپنے اصلی خد و خال میں پیش کیا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے موصوف کی تحقیقی وسعتوں اور تدقیقی نگاہوں کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

فاضل مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے کہ فتنۂ عبداللہ بن سبار ایک جانی بوجھی سکیم کے ماتحت ہی اٹھایا گیا ہے۔ اور اس نامعلوم شخصیت کو شیعہ قوم کے سر منڈھنے کی کوشش صرف اس لئے کی گئی ہے کہ شیعیت کو بدنام کر کے عوام النّاس اور سادہ لوح انسانوں کو متاثر کیا جا سکے۔

اس کتاب کا مطالعہ تحقیق طلب افراد کے لئے ناگزیر ہے۔ اس کے مطالعے سے اس امر کا بخوبی انکشاف ہو سکتا ہے کہ اہلِ بیت کے مذہب و طریقہ پر پردہ ڈالنے کے لئے کون کونسے حربے اور کس قدر اوچھے ہتھیار استعمال کئے گئے۔ اور لوگوں کو مذہبِ حقہ سے دور رکھنے کے لئے کس طرح انصاف سوز روش اختیار کی جاتی رہی۔

میری دعا ہے کہ مصنفِ محقق کو خداوندِ عالم مزید توفیقات مرحمت فرمائے تاکہ زیادہ سے زیادہ اپنے تحقیقی مواد کو قوم کے سامنے پیش فرما سکیں۔ اور خداوندِ عالم مؤمنین کو توفیق دے کہ ان جیسے فاضل اشخاص کی ہمت افزائی فرما کر ان کو نمایاں خدمتِ قوم کا موقعہ دیں۔

نیز ادارہ جامع المنتظر لاہور کو خدا زیادہ سے زیادہ ترقی عطا فرمائے تاکہ ان کی وساطت سے قومی پوشیدہ لٹریچر منظرِ عام پر آسکے۔

واقعاً لائقِ صد ستائش ہے "ادارہ مکتبہ الناصر" جس نے اس قسم کی بیش بہا تصانیفِ قوم کو منصۂ شہود پر لانے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ عنقریب کتاب "دین و اسلام" بھی اسی ادارہ کی ہمت سے قارئین کے پیش ہونے کا شرف حاصل کر سکیگی۔

حررہ الاحقر

حسین بخش

باب النجف جاڑا۔ ضلع ڈیرہ اسماعیل خان

ہمارے اہم ماخذ

نمبر	کتاب	مصنف
۱	تاریخ الامم والملوک	مورخ طبری
۲	تاریخِ کامل	ابنِ اثیر
۳	تاریخِ ابن عساکر	ابن عساکر
۴	روضۃ الصفا فارسی	خاوند شاہ
۵	البدایۃ النہایہ	ابنِ کثیر
۶	کتاب السنۃ والشیعہ	رشید رضا
۷	تاریخ الاسلام السیاسی	حسن ابراہیم
۸	فجر الاسلام	احمد امین
۹	جامع اللغات (اردو)	ابنِ ندیم
۱۰	فہرستِ ابن ندیم	ابنِ ندیم
۱۱	میزان الاعتدال	علامہ ذہبی
۱۲	تہذیب التہذیب	ابن حجر
۱۳	اللئالی مصنوعہ	سیوطی
۱۴	انساب الاشراف	بلاذری
۱۵	طبقاتِ ابن سعد	ابنِ سعد
۱۶	فتح الباری	ابنِ حجر
۱۷	سیرتِ حلبیہ	علامہ حلبی
۱۸	معارف ابنِ قتیبہ	ابن قتیبہ
۱۹	الفائق	زمخشری
۲۰	عقد الفرید	ابن عبدربہ اندلسی
۲۱	مراۃ الجنان	امام یافعی
۲۲	تاریخ یعقوبی	علامہ ابن واضح کاتب
۲۳	سیرت ابنِ ہشام	ابنِ ہشام
۲۴	شرح حدیدی	ابن ابی الحدید معتزلی
۲۵	نہج البلاغۃ	کلام امیر المومنینؑ
۲۶	المحاضرات	راغب اصفہانی
۲۷	ابن خلدون	مورخ ابنِ خلدون
۲۸	حیوۃ الحیوان	کمال الدین دمیری
۲۹	الامامۃ والسیاسۃ	ابنِ قتیبہ
۳۰	قرآنِ مجید	کلام الٰہی
۳۱	درِ منثور	سیوطی
۳۲	کنز العمال	علی متقی
۳۳	مروج الذہب	علامہ مسعودی
۳۴	ینابیع المودۃ	سلمان قندوزی
۳۵	دراسات اللبیب	ملا معین
۳۶	خصائص نسائی	امام نسائی
۳۷	الاستیعاب	ابو عمر عبدالبر
۳۸	اصابہ فی تمیز الصحابہ	ابن حجر

۳۹ الفتنۃ الکبریٰ .. ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصر

۴۰ الفتنۃ الکبریٰ (فارسی) محمد علی خلیلی

۴۱ الفتنۃ الکبریٰ (اردو) ترجمہ پروفیسر محمد منور

۴۲ عبداللہ بن سبا .. مرتضیٰ عسکری نجف

۴۳ اموی دورِ خلافت .. سید محمد باقر

۴۴ البلاغ المبین .. محمد سلطان مرزا

۴۵ فلک النجاۃ .. حکیم امیر الدین

۴۶ اصحاب امیر المومنینؑ .. سرفراز لکھنؤ

۴۷ اصل و اصولِ شیعہ .. آل کاشف الغطاء

۴۸ الوعد الحق .. .. ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصر

۴۹ الغدیر .. .. علامہ امینی تبریزی

۵۰ حجر بن عدی .. علامہ کرائی ایران

۵۱ الی مشیخۃ الازھر .. استاد عبداللہ سبیتی

۵۲ وعاظ السلاطین .. ڈاکٹر علی الوردی

۵۳ زندگانی محمدؐ .. محمد حسین ہیکل

۵۴ شخصیات قلقۃ فی الاسلام .. عبدالرحمٰن بدوی

۵۵ نقش وعاظ در اسلام .. ترجمہ محمد علی خلیلی

۵۶ عمار یاسر .. عبداللہ سبیتی عراق

۵۷ روح المعانی .. علامہ آلوسی بغدادی

۵۸ اہل البیت .. .. جودۃ السحار مصری

۵۹ مکتب تشیع .. .. علامہ طباطبائی قم

۶۰ تاریخ الشیعہ .. ڈاکٹر حسین علی

۶۱ تحفۃ الاحباب .. .. شیخ عباس قمی

۶۲ جامع الرواۃ .. .. علامہ اردبیلی

۶۳ شرح عقائدِ صدوق .. شیخ مفیدؒ

۶۴ سازمانہائے تمدن .. } پروفیسر گوبارد
امپراطوری اسلام .. }

۶۵ مسند احمد بن حنبل .. امام احمد بن حنبل

۶۶ صواعق محرقہ .. ابن حجر مکی

۶۷ الامام علی ابن ابی طالبؑ .. استاد عبدالفتاح

۶۸ النزاع والتخاصم .. مقریزی

۶۹ العواصم من القواصم .. ابن عربی

۷۰ رسالہ عقدِ امِ کلثوم .. محمد انشاء اللہ حنفی

۷۱ کربلا کی شیر دل خاتون .. ڈاکٹر عائشہ مصری

۷۲ سیرۃ النبیؐ .. .. علامہ شبلی

۷۳ فتنۂ ابن سبا .. .. مجہول الاسم

۷۴ قرۃ العینین .. .. شاہ ولی اللہ

۷۵ رجال کشی .. .. ابو عمر کشی

عبداللہ بن سباء

کے متعلق

فاضل مورّخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری فرماتے ہیں :-

"ابن سباء بالکل فرضی اور من گھڑت چیز ہے۔ اور جب فرقۂ شیعہ اور دیگر اسلامی فرقوں میں جھگڑے چل رہے تھے تو اُس وقت اِسے جنم دیا گیا۔ شیعوں کے دشمنوں کا مقصد یہ تھا کہ شیعوں کے اصولِ مذہب میں یہودی عنصر داخل کر دیا جائے۔ اموّیوں اور عبّاسیوں کے دَورِ حکومت میں شیعوں کے دشمنوں نے عبداللہ بن سباء کے معاملہ میں بہت مبالغہ آمیزی سے کام لیا۔ اس کے حالات بہت بڑھا چڑھا کر بیان کئے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ تھا کہ حضرت عثمان اور اُن کے عمالِ حکومت کی طرف جن خرابیوں کی نسبت دی جاتی ہے اور ناپسندیدہ اُمور جو اُن کے متعلق مشہور ہیں کو سُن کر لوگ شک و شبہ میں پڑ جائیں۔ دوسرا فائدہ یہ کہ علیؑ اور اُن کے شیعہ لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہوں۔ نہ معلوم شیعوں کے مخالفین نے شیعوں پر کتنے غلط الزامات لگائے، اور نہ جانے شیعوں نے کتنی غلط باتیں اپنے دشمنوں کی طرف عثمان وغیرہ کے معاملہ میں منسوب کیں۔"

(الفتنۃ الکبریٰ جلد اوّل ص۱۳۲ مطبوعہ مصر)

ضروری گذارش

"عبداللہ بن سبا" کے عنوان سے یہ تالیف اربابِ فکر کی خدمت میں انتہائی جسارت کے ساتھ پیش کی جارہی ہے۔ اس کتاب میں داستان سرا رواۃ اور الزام تراش مورخین کی مفروضہ داستان کے خیالی ہیرو "عبداللہ بن سبا" کے نیست و بود پر تاریخی تجزیہ اور محققانہ تبصرہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

چونکہ ان مورخین اور واضعینِ قصہ نے یہ لکھا ہے کہ عبداللہ بن سبا یمن کا یہودی تھا جو زمانہ خلافتِ عثمانیہ میں بظاہر مسلمان ہوا۔ مگر اُس نے نفاق کے لباس میں غلط نظریات و عقائد کی نشر و اشاعت کی۔ شیعہ کے مخصوص عقائد کا صحیفہ اُسی نے مرتب کیا اور ملتِ اسلام کے اکابرین جو جلیل القدر صحابہؓ بھی تھے کو درسِ فتنہ انگیزی وکینہ پروری پڑھا کر اسلام کی ہیئتِ اجتماعیہ کو کاری ضرب پہنچائی۔ اور خود مسلمانوں کے ہاتھوں اسلامی حکومت کے سربراہ کو قتل کرادیا۔ اس کے بعد انعقادِ خلافت امیر المومنین علی علیہ السلام بھی اسی سبائی پارٹی کے اثر و رسوخ اور غلبۂ اقتدار سے وقوع پذیر ہوا، اور اس کے بعد جنگِ جمل کے واقعات بھی ایسے ہی لوگوں کے خیالات اور اُن کی خفیہ سازشوں کا نتیجہ تھے۔ اس لئے کتاب ہٰذا میں صدرِ اوّل کے اس پُر آشوب دَور کے حالات کا تاریخی جائزہ۔ قتلِ عثمانؓ کا پس منظر۔ حضرت امیر المومنینؑ کی خلافت کے متعلق صحابۂ کرامؓ کا مسلک اور جنگِ جمل کے علل و اسباب کا مختصر مگر جامعیت کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس ذیل میں ہم نے صحیح اسلامی ماخذوں کو سامنے رکھکر فکر و نظر کی روشنی میں اور درایت کے اصول کے تحت یہ ثابت کیا ہے کہ "عبداللہ بن سبا" ایک خیالی شخصیت ہے اور جس کا وجود دنیا میں کبھی تھا ہی نہیں۔ اس شخصیت کو جنم دینے والے مخصوص ذہنیت کے حامل

مورّخ اور اربابِ اقتدار کی غلط کاریوں کو پردۂ خفا میں رکھنے والے مصنّفین ہیں ورنہ قرنِ اُولیٰ کے اکابرینِ اسلام ایسی باتوں سے بہت بلند ہیں کہ ایک یہودی نژاد نومسلم اسلام کے احکام اور اس کے اصول و مبادیات انھیں پڑھائے، اور وہ بے دریغ اسکے جھانسے میں آکر ملّتِ اسلامیہ کی بیخ کنی شروع کردیں۔ مگر مسلمانوں میں ایسے بالغ نظر مورّخ بھی موجود ہیں جو بال کی کھال اتارنا جانتے ہیں اور اسلاف پرستی کی کورانہ تقلید کی بندھنوں سے آزاد ہوکر تاریخی حقائق کو جدید فکر کی روشنی میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

اس ضمن میں عہدِ حاضر کا نامور فلسفی مورّخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری سرِفہرست نظر آتا ہے فاضل مورخ نے اپنے دعوے کے مطابق بالکل بے لاگ ہوکر اسلام کے اس پرفتن دَور کے واقعات کو نئے اسلوب سے پیش کیا ہے۔ 'الفتنۃ الکبریٰ' ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ پہلی جلد میں حضرت عثمان کے زمانہ کے حالات ہیں اور دوسری جلد میں حضرت علیؑ اور ان کے بیٹوں کے واقعات تحریر کیے ہیں۔ اس کتاب کا مکمل ترجمہ حیدرآباد (انڈیا) میں ہوچکا ہے۔ اور اب پاکستان میں صرف پہلی جلد کا ترجمہ ادارۂ طلوعِ اسلام لاہور کے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ ہم اربابِ ذوق کو اس کے مطالعہ کی ترغیب دیتے ہیں کہ وہ ضرور پڑھیں۔ تاکہ اربابِ علم یہ سمجھ لیں کہ عرب ممالک کے جدید مفکر کس طرح غیر جانبدارانہ انداز میں سوچتے اور لکھتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارے ملک کے اہلِ دانش مورّخ اور ذہین مفکّر اسی روشنی میں سوچیں اور صحیح تاریخ نویسی کی داغ بیل ڈالیں۔

عبداللہ بن سبا کے وجود اور عدم وجود کے اثبات و نفی کے سلسلہ میں اساسی طور پر ہم نے اس کتاب کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ چنانچہ ہماری تالیف میں زیادہ تر اقتباسات اسی کتاب سے لئے گئے ہیں۔ علاوہ دیگر اسلامی ماخذوں کے اپنی بحث کی تائید میں ہم نے زیادہ تر جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے وہ فاضلِ اجل مرتضیٰ عسکری نجفِ اشرف

(عراق) کی کتاب "عبداللہ بن سبا" اور "اموی دورِ خلافت" مؤلفہ مدیر اصلاح کھجوہ ہیں۔ ناشکر گزاری ہوگی کہ اگر ہم ان کی خدمت میں خراجِ عقیدت پیش نہ کریں۔ ان کی ان گرانقدر تالیفات اور جدید تحقیقات پر ہدیۂ تبریک پیش کیا جاتا ہے۔

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

ہم نے اس تالیف میں تاریخی حقائق کو مدِ نظر رکھا ہے۔ اور تاریخِ اسلام کے معتبر ماخذوں سے استفادہ کیا ہے۔ اور ساتھ ہی قدرے مذہبی نقطۂ نظر سے ہٹ کر اس وقت کے محض سیاسی حالات کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے جن حضرات کے دلوں میں اس کتاب کے پڑھنے سے ہمارے پیش کردہ تاریخی اقتباسات پر شکوک وارد ہوں وہ اصل ماخذوں کی طرف رجوع فرما سکتے ہیں۔ نیز یہ بات بھی ممکن ہے کہ اس کتاب کے منصّۂ شہود آجانے کے بعد اسلامی حلقوں میں قدرے حیرت و استعجاب کا اظہار ہو۔ اور جن کے قلم بغیر سوچے سمجھے کسی کا تعاقب کرنے کے عادی ہو چکے ہیں وہ انگشت بدنداں رہ جائیں۔ کہ ایک ایسی اہم شخصیت اور انقلابی لیڈر جس کا ذکر تاریخ و رجال کی ہر کتاب میں موجود ہے، کے وجود کو ہی ختم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر ہم یہ عرض کئے دیتے ہیں کہ اوّل تو ہم اس دعوے میں منفرد نہیں، جیسا کہ آئندہ صفحات میں معلوم ہو جائے گا۔ اور دوسرے یہ ہماری ذاتی تحقیق ہے۔ نہ تو اس کتاب میں اہلِ سنن کے خیالات و عقائد کی ترجمانی ہے اور نہ ہی امامیہ حضرات کو خواہ مخواہ مجبور کیا گیا ہے کہ وہ ہماری بات کو ضرور ہی تسلیم کرلیں۔ محض مخلصانہ جذبات کے تحت اربابِ نظر اور اصحابِ فکر کو سوچنے کی دعوت دی گئی ہے۔ تاکہ ان مندرجات کے مطالعہ کے بعد میں اپنی اس تحقیق کے خطاب و صواب کے پہلوؤں سے آگاہ فرمائیں۔

منظور بخاری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پروپیگنڈے کے نتیجہ خیز اثرات

جس علمِ تاریخ کو مسلمانوں نے پہلی دفعہ دنیا میں مدوّن کیا اور باقاعدہ اسے ایک فن کی حیثیت عطا کر کے آنے والی نسلِ انسانی کے لئے بطورِ عبرت چھوڑا اس کے بارے میں نہایت افسوس کے ساتھ تحریر کرنا پڑتا ہے کہ کچھ عرصہ بعد اُسے ایسے لوگ بھی لے اُڑے جن کی نیت تخریبی تھی۔ انہوں نے بعض فرضی افسانوں کو اعتبار کا قالب دیکر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مستند تاریخیں بھی ایسے لوگوں کے خیالات سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ ان کے فرضی قصّوں کے متواتر پروپیگنڈے کے اثرات اس حد تک نتیجہ خیز ثابت ہوئے کہ سچ کو جھوٹ سے بمشکل تمیز کیا جا سکتا ہے۔

کذب بیانیوں اور افسانہ تراشیوں کی حالت عہد بعہد پروان چڑھتی گئی۔ مگر ان وضعی روایات اور مبالغہ آمیزی پر نقد و نظر کرنے کی کوشش کماحقہٗ نہیں کی گئی۔ نفرت تعصب اور اختلاف و عناد کی خلیج اس قدر وسیع ہوتی گئی کہ بعض لوگ کسی بات کو حق جانتے ہوئے بھی مفروضہ داستانوں کے رواۃ کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے نظر آتے ہیں۔ افسوس کہ یہ اختلافات فقط ذاتی آراء اور مذہبی عقائد تک ہی محدود رہتے مگر صورتِ حال یہ ہے کہ نقطۂ خیال کے اختلاف نے نفرت و اعتراض اور تشتّت و افتراق کی راہ اختیار کر لی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملّتِ اسلامیہ کی اساس وحدت متزلزل ہو کر رہ گئی۔ یہ سب کچھ بعض اقتدار پسند طبائع اور ان کے حاشیہ نشین نام نہاد اہلِ علم

کی ذہنی بے راہ روی کا اثر ہے۔ جو آج تک اصل حقیقت کے خلاف محض اقتدار اور پروپیگنڈے کے زور سے مسلمانوں کو افترا پردازی اور تفرقہ بازی کی راہ پر ڈال دیا گیا ہے۔

یہ حقیقت اپنے مقام پر مسلم ہے کہ پروپیگنڈا ایک جادو ہے۔ عوام کا متاثر ہونا تو یقینی ہے، خواص بھی اس کا شکار ہو جایا کرتے ہیں۔ کسی بے بنیاد بات کو واقعے کے طور پر اگر بار بار بیان کیا جائے تو کچھ دنوں بعد وہ ایسی صداقت بنتی چلی جائے گی کہ جس کا انکار ناممکن نظر آنے لگے گا۔ پہلے کہنے والا محض ایک ہو گا۔ پھر چند اور آدمی سُنی سُنائی بات کو لے اُڑیں گے۔ یہاں تک کہ وہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ایک ناقابلِ انکار حقیقت کے لباس میں ملبوس نظر آئے گی۔ یہ پروپیگنڈے اور غلط شہرت کا ہی تو اثر ہے کہ بات سے بتنگڑ بن جاتا ہے۔

ہندوستان میں عرصۂ دراز سے یہ تنفر آمیز پروپیگنڈا جاری رہا کہ مسلمان بادشاہ خصوصاً اورنگ زیب وغیرہ اہلِ ہنود کے ساتھ متعصبانہ رویہ رکھتے تھے۔ اِس سلسلہ میں انھیں ظالم اور سفاک بھی کہا گیا۔ مگر اہلِ بصیرت جانتے ہیں کہ یہ بالکل جھوٹے الزام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت کے جذبات کو ابھارنے کے لئے محض پروپیگنڈا ہے۔ مگر اس کا اثر ہوتا رہا اور اہلِ اسلام کی نسبت حقارت بڑھتی گئی۔ اور آج اس کے نتائج اظہر من الشمس ہیں۔

اسی طرح جنگِ آزادی میں جب غیر ملکی حکمرانوں نے اہلِ ہند کے خون سے ہولی کھیلی اور اپنی جارحانہ قوتوں سے ہندوستان پر دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا۔ تو جن لوگوں نے غدر کے دوران میں اربابِ اقتدار سے مخالفت کی تھی اُن کے متعلق بہتان اور اتہام تراشی کا ایسا مواد جمع کیا گیا کہ جس سے آئندہ نسل کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ فتنہ و فساد کے بانی اہلِ ہند تھے۔ اور ساتھ ہی ان کی سیرت و کردار کو ایسے رنگ میں پیش کیا کہ اخلاقی حیثیت سے گویا وہ انسان ہی نہ تھے۔ اب جبکہ سرکارِ انگلشیہ رخصت ہوئی

اور ضمیر آزاد ہوئے اور اہلِ ملک جنگِ آزادی کی تاریخ لکھنے بیٹھے تو انھیں یہ سب باتیں بے سروپا نظر آئیں۔ ان کی سیاسی بصیرت نے بھانپ لیا کہ یہ سب کچھ غیر ملکی اربابِ حکومت کی وقتی سیاست اور فقط پروپیگنڈے بازی کا ہی ردِ عمل تھا کہ جس کی وجہ سے اس قسم کے حیرت انگیز الزامات تراش لئے گئے۔

جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا دینا پروپیگنڈے کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے۔ اس سلسلہ میں ایک قصّہ بطورِ مثال بیان کیا جاتا ہے۔ کہ ایک شخص بکری کا بچّہ بغل میں لئے کہیں جا رہا تھا۔ تین نوجوان ایک مقام پر کھڑے تھے۔ جب انھوں نے اس کو آتے دیکھا تو منہ میں پانی بھر آیا۔ خیال کیا کہ کسی نہ کسی صورت میں یہ بکری کا بچّہ اگر ہاتھ لگ جائے تو کباب خوب بنیں گے، مگر وہ کیسے دے؟ کہتے ہیں کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ فوراً ایک بات ذہن میں آگئی، اور وہ یہ کہ ہم تینوں تھوڑی تھوڑی دور جا کر کھڑے ہو جائیں اور جب یہ شخص ہر ایک کے پاس سے ہو کر گزرے تو تینوں متفق اللفظ ہو کر اپنی اپنی باری میں نہایت سنجیدگی سے بکری کے بچّے والے کو اس امر کا یقین دلانے کی کوشش کریں کہ یہ بکری کا بچّہ نہیں بلکہ کتّا ہے۔ چنانچہ وہ شخص چلتا ہوا جب پہلے کے پاس سے گزرنے لگا تو اُس نے نہایت ادب سے مزاج پُرسی کرتے ہوئے کہا کہ حضور! آپ کی بغل میں یہ کُتّا کیسا؟ وہ شخص کچھ ناراض ہو کر آگے چل دیا۔ تھوڑی دور چلا تھا کہ دُوسرے نوجوان سے سامنا ہوا۔ مراسم مزاج پُرسی کے بعد اُس نے بھی وہی بات کہی کہ جنابِ والا! آپ نے کُتّا کیوں اٹھایا ہوا ہے؟ اُس شخص کے پاس سے بھی وہ لاپروائی کے انداز سے گذر گیا۔ مگر ساتھ ہی اُس کے دل میں شبہات کی رَو بہنے لگی اور خیال کرنے لگا کہ شاید یہ کُتّا ہی ہو۔ اب جبکہ تیسرے آدمی کے پاس پہنچا تو اُس نے بھی نہایت انکساری سے ویسا ہی کہا جیسا کہ اُس کے پہلے دو ساتھی کہہ چکے تھے۔ اب تو اُسے یقین ہو گیا کہ یہ بکری کا بچّہ نہیں بلکہ کُتّا ہی ہے۔

ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ فرضی ہی ہو اور واضع نے اسے محض پروپیگنڈے کے اثرات کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے وضع کیا ہو، اور یا یہ کہ جس شخص کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا وہ دماغی توازن ہی نہ رکھتا ہو۔ مگر یہ تو ماننے کی بات ہے کہ ایک دو ساعت میں فقط تین آدمیوں نے ہی بکری سے کتّا بنا دیا۔ کیسا جادو تھا اور کیسی سوچی سمجھی سکیم تھی جو محض نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے صریحًا کذب بیانی سے تجویز کی گئی کہتے ہیں یہی اصول پروپیگنڈے کی جان ہوتا ہے۔

تاریخ دان حضرات جانتے ہیں کہ جب اسی پروپیگنڈے اور اشتہار بازی کی سرپرستی مطلق العنان حکومتیں کرتی ہیں تو وہ اپنے حزبِ مخالف کو عوام الناس کی نظروں میں ذلیل کرنے کے لئے کوئی بھی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرتیں۔ ان کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ سیاسی حریف کی سیرت و کردار اور اس کے مذہب کو ایسی سطح پر لایا جائے کہ جہاں دنیا اُن کی طرف رجوع ہی نہ کر سکے۔ مزید برآں ایسی حکومتیں جب ایک پوری قوم کی سیاسی و مذہبی تاریخ اپنے زیرِ سایہ مدوّن کر رہی ہوں تو بھلا وہ کیونکر اپنی مَن مانی باتوں کے متعلق پروپیگنڈا نہ کرتی ہوں گی۔

صدرِ اوّل میں جب اسلامی حکومت کی باگ ڈور بنو اُمیہ کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے ایک طرف تو اپنے سیاسی و مذہبی حریف کی دینی پوزیشن کو گرانے کے لئے علانیہ منابرِ اسلامیہ پر نازیبا کلمات استعمال کئے اور کروائے۔ اور دوسری طرف احادیث و تاریخ کی تدوین بھی شروع کرا دی تاکہ آئندہ نسل کو حسبِ دلخواہ دینی و سیاسی لٹریچر مہیا کیا جا سکے۔ علامہ شبلی ایسے فاضل مورخ بھی اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔

"حدیثوں کی تدوین بنو اُمیہ کے زمانہ میں ہوئی جنہوں نے پورے نوّے برس تک سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد جامع میں آلِ فاطمہؑ کی توہین کی اور جمعہ میں برسرِ منبر حضرت علیؑ پر لعن کہلوایا۔"

(سیرۃ النبی جلد اوّل صہ۱۰ اعظم گڑھ)

اِس سلسلہ میں امیرِ شام معاویہ بن ابوسفیان نے جہاں علیؑ اور اولادِ علیؑ کی توہین کے ضمن میں روایات واحادیث وضع کرائیں۔ وہاں اقتدار کے زور سے اس بات کو بھی شہرت دی کہ علیؑ اور اولادِ علیؑ پر سب و شتم کرنا (نعوذ باللہ) سنّتِ رسولؐ ہے۔ اور یہ کہ علیؑ ابن ابی طالب عرب کے چور اور مشہور ڈاکو ہیں۔

فاضل معتزلی لکھتے ہیں:-

"کہ ایک دفعہ ابن عباس نے معاویہ سے کہا کہ علیؑ کو گالیاں دینے سے باز کیوں نہیں رہتا؟ تو جواب دیا گیا کہ میں اُس وقت تک خاموش نہیں ہونگا جب تک کہ اس طریقہ پر لڑکے جوان اور جوان بوڑھے نہ ہولیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہاں تک کہ عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انھوں نے اس بدعت کو بند کیا۔ اور لوگوں میں واویلا ہونے لگا کہ خلیفہ نے سنّتِ رسولؐ کو ترک کر دیا ہے۔"

(شرح نہج البلاغۃ حدیدی جلد ۳ صفحہ ۲۵۵)

امیرِ شام کے سیاسی انتظام اور علی المرتضیٰ علیہ السلام کے خلاف پروپیگنڈے نے یہ صورت اختیار کر لی تھی کہ لوگ علی علیہ السلام کے مرتبہ و شان سے اس قدر ناآشنا ہو گئے کہ جب اہلِ شام کے ایک عقلمند آدمی سے یہ بات پوچھی گئی کہ جس ابوتراب کو امام معاویہ بُرا بھلا کہتا ہے وہ کون ہے؟ تو اُس شامی نے کہا کہ میرے علم کے مطابق وہ کوئی فتنہ باز اور ڈاکو آدمی ہے۔" (مروج الذہب جلد ۲ ص ۳۳ طبع مصر)

میرے ناظرین پر یہ بات اچھی طرح روشن ہو گئی ہو گی کہ حقیقت کے خلاف غلط شہرت اور پروپیگنڈے کے اثر نے بدعت کو سنّتِ رسول اور برادرِ رسولؐ حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام ایسے اسلام کے بطلِ جلیل کو چور اور ڈاکو خیال کرنے پر عوام الناس کو مجبور کر دیا۔ اس طرح بہت سی باتیں سیاسی مصالح کی بناء

پر مشہور کر دی جاتی ہیں، جو واقعیت کے اعتبار سے ایک افسانہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ لیکن انھیں شہرت اتنی ہو جاتی ہے کہ حقیقت سمجھ لیا جاتا ہے۔

ایسے ہی بے حقیقت اُمور میں سے جناب پیغمبر اسلام کی بنات کے تعدد کا مسئلہ ہے حالانکہ جناب فاطمۃ الزہرا صلوات اللہ علیہا کے علاوہ آنحضرتؐ کی کوئی دوسری لڑکی نہ تھی۔ فقط اتنی ہی بات پر اکتفا نہیں ہوا بلکہ محسنۂ اسلام جناب خدیجۃ الکبریٰؓ کے متعلق یہ بات مشہور کر دی گئی ہے کہ وہ آنحضرتؐ سے پہلے کئی شوہروں سے عقد کر چکی تھیں۔ حالانکہ حضرت خدیجہؓ کا عقد جب آنحضرتؐ سے ہوا تو آپ باکرہ تھیں۔ اس سلسلہ میں خان بہادر سید غلام عباس مؤلف و مترجم "بطلۂ کربلا" جو "کربلا کی شیر دل خاتون" کے نام سے امامیہ مشن لاہور کے اہتمام سے شائع ہو چکی ہے کی تحقیق انیق پیش کی جاتی ہے۔

عام مورخین یہ لکھتے ہیں کہ جب آنحضرتؐ کا عقد حضرت خدیجہؓ سے ہوا۔ اس وقت کے تمام روسائے عرب اور اشراف حجاز یہ چاہتے تھے کہ وہ حضرت خدیجہؓ سے عقد کریں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے پیغامات بھی بھیجے۔ مگر خدیجہؓ نے جو ملیکۃ العرب کے نام سے مشہور تھیں سب کے پیغامات کو ٹھکرا دیا۔ افسانہ نویس مورخ یہ نہ سمجھ سکے کہ وہ باکرہ پن کی حالت میں تو عرب کے غیر ممتاز لوگوں سے عقد کر لیتی ہیں مگر چند شوہروں کی زوجیت میں آنے کے بعد وہ اپنے آپ کو اتنا بلند پاتی ہیں کہ شیوخِ عرب اور اشرافِ قریش میں کسی کو بھی اس قابل نہیں سمجھتیں کہ کسی ایک سے عقد کر لیں۔ عقد تو درکنار کسی سے بات تک کرنا گوارا نہ کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخیں حکومت کے اشاروں پر سیاست کی آڑ میں لکھی گئیں حضرت خدیجہؓ کے اعلیٰ کردار کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی غرض سے اس فرضی افسانہ کو شہرت دی گئی۔ دراصل اس مقدس خاتون نے آنحضرتؐ سے پہلے کوئی عقد نہیں کیا۔ وہ پورے جزیرۃ العرب میں کسی کو اپنا ہمسر نہ پا کر کسی اچھے وقت کا انتظار کرتی رہیں۔ جوئندہ یابندہ کے مصداق ان کی حقیقت شناس نگاہ نے فقط رحمۃ للعالمینؐ کو ہی انتخاب کیا۔ یہ امر

کہ حضرت خدیجہؓ رسول اللہؐ کے عقد کے وقت دوشیزہ تھیں فقط ہماری خیالی تحقیق ہی نہیں بلکہ اجلّہ علماء اعلام وزعماء اسلام شیخ مفید۔ شیخ طبرسی۔ سیّد مرتضیٰ۔ ابن شہر آشوب مازندرانی۔ محمد ابن عبدالرحمٰن اصفہانی۔ عماد الدین حسن الطبرسی اور ابو القاسم کوفی وغیرہ بھی اس دعوے کی تصدیق کر چکے ہیں۔

ان ہی محققین نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ زینب ورقیہ اور ام کلثوم آنحضرتؐ کی صلبی لڑکیاں نہ تھیں بلکہ ابو ہند تمیمی جو حضرت خدیجہؓ کی خواہر ہالہ بنت خویلد کا شوہر تھا اُس کی بیٹیاں تھیں۔ والدین کے بعد یہ لڑکیاں چونکہ کفالتِ خدیجہؓ میں تھیں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عقد کرنے کے بعد حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ان کو بھی خانۂ رسالت میں لے آئیں۔ عرب کے رواج کے مطابق ان کو بناتِ رسول کہا جانے لگا۔ مورخین نے ان کے ربیبہ ہونے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ لکھ دیا کہ یہ آنحضرتؐ کی صلبی لڑکیاں تھیں۔ اور آج تک یہ ہمہ گیر شہرت اور پروپیگنڈا اپنا اثر دکھاتا چلا آتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے تحقیق سے کام لیا اور روایت پرستی کی اندھا دھند تقلید سے اپنی گردن کو آزاد کر لیا وہ اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں کہ یہ لڑکیاں آنحضرتؐ کی صلبی نہ تھیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کتبِ احادیث کے ابواب مناقب میں حضرت فاطمہ علیہا السلام کے علاوہ ان مخدرات کے فضائل اور مناقب بھی پڑھنے میں نظر آتے۔ اس سلسلہ میں اہلِ علم کا بیان ہے کہ ہم نے بناتِ رسولؐ کے مسئلہ کو محض شہرت کی بناء پر لکھا ہے مولوی محمد انشاء اللہ خاں محمدی۔ صدیقی۔ حنفی۔ چشتی۔ بدایونی تک نے بھی اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"ہم نے رسول اللہؐ کی چار بیٹیاں شہرت کی بناء پر لکھی ہیں ورنہ روایات پر بناء رکھی جاتی تو اختلافات کی شدت کو دیکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ تحقیقی اور یقینی بات صرف یہی ہے کہ حضور ختمی مرتبت

کی بیٹی جناب خدیجۃ الکبریٰؓ کے بطن سے فقط حضرت زہراؓ ہی متولد ہوئیں"۔

(رسالہ السر المختوم فی تحقیق عقد ام کلثومؓ صد۱ مطبوعہ جامع)

ایسے ہی واہی اور فرضی افسانوں میں شہرت رکھنے والا واقعہ حضرت ام کلثومؓ بنت فاطمۃ الزہرا صلوات اللہ علیہما کا ہے کہ ان کا نکاح حضرت عمرؓ سے ہوا۔ آل محمدؐ کی خاندانی شرافت اور اُن کے معیاری کردار کو نام نہاد مورخین نے جہاں اور بہت سے فرضی الزام لگا کر محض پروپیگنڈے کے اثر سے داغدار کرنے کی کوشش کی ہے وہاں خاندانِ رسولؐ کے حسنِ معاشرت کو غلط رنگ میں نمایاں کرنے کے لئے جہاں بناتِ رسولؐ کا قصہ گھڑا گیا وہاں اس بے بنیاد افسانے کو بھی تاریخ میں جگہ دیدی کہ حضرت عمرؓ نے جناب ام کلثوم بنتِ علی سے عقد کیا۔ جن روایات کی بنا پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ سب کی سب گھڑی ہوئی ہیں جن کا سب سے پہلا راوی اور واضع زبیر بن بکار ہے جسے علیؑ اور اہلِ بیت علیہم السّلام سے انتہائی دشمنی تھی۔ اس کے علاوہ علاّمہ ابو الفضل احمد بن علی سلیمانی کا یہ قول علاّمہ ذہبی جیسے ناقدِ فن اور امامِ رجال نے بھی نقل کیا ہے کہ زبیر بن بکار کا شمار اُن لوگوں میں ہے جو من گھڑت احادیث اور فرضی افسانے وضع کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی مرویات ساقط عن الاعتبار ہونے کی وجہ سے صحیحین میں جگہ نہ پا سکیں۔ اب اگر ایسے افسانہ گو کا نقل کردہ واقعہ ہم تک پہنچے اور اُس واقعہ میں اہلِ بیت کی توہین کا پہلو بھی نمایاں ہو تو اُسے کیسے تسلیم کر لیا جائے؟۔ حالانکہ شہرت اور پروپیگنڈے کا تقاضہ یہ ہے کہ اسے بغیر تنقیدی نظر کے دیکھنے کے بسر و چشم قبول کر لیں۔ خود نفسِ واقعہ کے موضوع ہونے کے لئے خارجی دلائل پیش کرنے کی چنداں ضرورت نہیں بلکہ اس قصّہ کے ناقلین کی تضاد بیانی رواۃ کا انتہائی اضطراب اور روایات کی مختلف صورتیں ہی اس امر کا ثبوت ہیں کہ یہ واقعہ فرضی ہے۔ مولوی محمد انشاء اللہ صدیقی حنفی نے اس مسئلہ کی تحقیق پر ایک رسالہ تالیف کیا

جس کا پورا نام "السر المختوم فی عقد ام کلثوم" ہے۔ اس رسالہ میں فاضل مؤلف نے اختلافات کی تمام صورتوں کو پیش کر کے اپنا تحقیقی بیان ان الفاظ میں پیش کیا ہے :-

"ناظرین ! یہ سب راوی اول کی فضولیات ہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ابتداً کسی مفتری زبیر بن بکار ایسے کذاب اور وضاع حدیث نے حضرت عمر پر تہمت لگائی اور حضرت علیؑ پر جھوٹ بولا ہے اور عقدِ کلثومؓ کا واقعہ اپنے دل سے تراش کر بیان کر دیا ۔"

(السر المختوم فی عقد ام کلثومؓ ص۲۱)

جس شخص نے رواۃ اور مورخین کے اس قصہ میں افترا پردازیوں کو بنظرِ غائر پڑھا ہے وہ فاضل موصوف کے بیان کی تصدیق کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ عقدِ کلثومؓ کے سلسلہ میں صاحب "استیعاب فی معرفۃ الاصحاب" نے جن تفصیلات کو پیش کیا ہے، اُن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمر ایسا مدبر انسان عالمِ پیری میں بھی ایک نابالغہ کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ حضرت علی علیہ السلام کی ہاشمی غیرت بھی مخدوش نظر آتی ہے کہ انھوں نے تمام سیاسی اختلافات کو بالائے طاق رکھکر اپنی صغیرہ بچّی کو بغیر عقد کئے غیر محرم کے ہاں بھیج دیا۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق کے لئے ملاحظہ ہو" استیعاب فی معرفۃ الاصحاب تذکرہ اُمّ کلثوم بنتِ علیؑ ۔"

نہ تو تاریخ کی صحیح شہادتیں ایسے فرضی واقعہ کی تصدیق کرتی ہیں، اور نہ ہی عقل سلیم اس بات پر یقین کرتی ہے کہ یہ اور اس قسم کے خلاف عقل و نقل مشہور افسانے صحیح ہوں گے۔ محض شہرت کی بنا پر متقدمین نے انھیں نقل کیا اور متاخرین حقیقت سمجھ بیٹھے۔

صدرِ اسلام کی تاریخ کا مشہور واقعہ مالک بن نویرہ یربوعی کا دردناک قتل جو فتنۂ ارتداد کے نام سے مشہور ہے کو ہم اپنے بیان کی تائید میں پیش کرتے ہیں کہ جب پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد مسندِ رسالت پر ایک غیر متعلق شخص کو متمکّن کر دیا گیا تو

اعیانِ اسلام میں سے کسی نے بھی اربابِ اقتدار کے سامنے بطیبِ خاطر سرِ تسلیم خم نہیں کیا اور نہ ہی کوئی اعراب میں سے سوائے چند ایک غیر معروف قبائل کے اس سیاسی انقلاب کا ہمنوا ہوا چنانچہ مالک بن نویرہ یربوعی جو آنحضرتؐ کی طرف سے عاملِ صدقات مقرر تھا۔ بھی سیاستِ وقت کا ساتھ نہ دے سکا۔ اور نہ ہی بیعتِ خلافت میں شریک ہوا۔ پیغمبرِ اسلام کی زندگی میں یہ لوگ آنحضرتؐ کے قول و فعل کے ذریعہ اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ سوائے خاندانِ رسالتؐ کے چشم و چراغ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے کوئی شخص بھی خلافتِ الٰہیہ ایسے عہدۂ جلیلہ کے لئے مستحق نہیں مگر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی، اور ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ جب دفعتہً انھوں نے خلافتِ اسلامیہ کی باگ ڈور بنی تیم کے ہاتھ میں دیکھی۔ اسی غیظ و غضب کی حالت میں مالک بن نویرہ نے صدقات کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔

اس ابہام کی تفصیل یوں سمجھیئے کہ اگر جنابِ رسالت مآبؐ کے بعد تختِ خلافت پر صحیح وارثِ رسولؐ ان کو نظر آتا تو وہ بیعت بھی کرتے اور زکوٰۃ بھی ادا کرتے۔ کیونکہ عقیدتاً وہ سچے مسلمان تھے۔ توحید و رسالت اور معاد پر اُن کا ایمان تھا۔ اور دیگر احکامِ اسلامیہ کو وہ پورے طور پر بجا لاتے تھے اور اُن کی مساجد اذانوں کی آواز سے گونج رہی تھیں۔ مگر اہلِ حکومت نے یہ مناسب نہ سمجھا۔ فوراً اس کی سرکوبی کے لئے خالد بن ولید ایسے فوجی جرنیل کو بھیج دیا۔ جس نے وہاں پہنچ کر باوجود ان کے اسلام کی تصدیق کے اُن پر عدم ادائیگی زکوٰۃ کا الزام لگا کر ارتداد عن الاسلام کا جرم عائد کر دیا اور سردارِ قبیلہ مالک بن نویرہ کو موت کے گھاٹ اُتارنے کے بعد بغیر انقضائے عدۃ اُس کی حسین و جمیل بیوی سے مقاربت بھی کی۔ (روضۃ الاحباب جلد ۲ ص ۲۷)

اب تاریخ کے ورق اُلٹیئے اور حضرت ابوبکر کی خلافت کے حالات کو غور سے پڑھیئے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ کس طرح اربابِ سیاست کے جارحانہ اقدامات

کو شرعی جواز عطا کرنے کے لئے تاریخ کی قطع و برید کی گئی۔ سیر و تواریخ اور حدیث و روایت کی جو بھی کتاب اٹھا کے دیکھی جائے وہاں حضرت ابوبکر کی خلافت کے ضمن میں فتنۂ ارتداد جلی قلم سے لکھا ہوا نظر آئے گا۔ مزید لطف کی بات یہ ہے کہ خلیفۂ اسلام کے اس اہم کارنامہ کی تائید میں قرآن کی بعض آیات کو بھی تاویل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود یہ حقیقت اپنے مقام پر اچھی طرح روشن ہے کہ مالک بن نویرہ پکا مسلمان تھا، وہ زکوٰۃ کا منکر نہیں تھا۔ اس امر کی شہادت خود تاریخ میں موجود ہے۔ صاحب روضۃ الاحباب تحریر فرماتے ہیں:۔

"جب مالک بن نویرہ خالد کے ہاتھوں قتل ہوا تو اس کا بھائی متمم بن نویرہ احتجاج کرتے ہوئے اصالتاً دربار خلافت میں پیش ہوا۔ اس سلسلہ میں حضرت عمر بھی اس کے ساتھ ہو لیئے۔ چنانچہ بیّن شہادتوں سے حضرت ابوبکر کو یقین دلایا گیا کہ مقتول مرتد نہیں تھا، خالد بن ولید نے ناحق قتل کیا ہے۔ حضرت عمر نے خلیفہ پر زور دیا کہ خالد بن ولید سے مقتول کا قصاص لیا جائے۔ مگر بعض سیاسی مصالح کی بنا پر قصاص تو نہ لیا گیا۔ البتہ مقتول کے ورثاء کو سرکاری بیت المال سے دیت ادا کر دی گئی"۔

(روضۃ الاحباب جلد ۲ صہ ۲۷)

بہر حال جو کچھ بھی ہوا، پروپیگنڈے نے مالک کو مرتد ثابت کر ہی دیا۔ اس کے خلاف خواہ کتنی ہی آواز بلند کی جائے تاریخ اُسے ضرور مرتد ہی کہے گی۔ کیا یہ پروپیگنڈا جادو نہیں جس کی سحر آفرینی نے آج تک مسلمانوں کو مغالطے میں ڈال رکھا ہے۔ بعض حکومتوں کے سیاسی مزاج ہی اس قسم کے ہوئے ہیں کہ انھوں نے ایسے بے سرو پا واقعات اور افسانوں کی سرپرستی کی اور اس سلسلہ میں حکومتوں کی پوری مشینری کو بھی استعمال کیا۔ ان کے علاوہ بھی تاریخ اسلام اور کتبِ احادیث میں ایسے واقعات

بکثرت ملتے ہیں جو محض غلط فہمی کی بناء پر مشہور ہو گئے۔ یا پھر منافقین کی ریشہ دوانیاں اپنا کام کر گئیں۔ جیسا کہ مورخین و محدثین نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق یہ لکھ دیا کہ آنحضرتؐ نے اپنی ازواج کو طلاق دیدی تھی۔ حالانکہ یہ بات واقعہ کے خلاف تھی۔ علامہ شبلی تحریر فرماتے ہیں:-

"آنحضرتؐ کے سکونِ خاطر میں یہ تنگ طلبی اس قدر خلل انداز تھی کہ آپ نے عہد فرمایا کہ ایک مہینہ تک ازواجِ مطہرات سے نہ ملیں گے۔ اتفاق یہ کہ آپ اس زمانہ میں گھوڑے سے گر پڑے اور ساقِ مبارک پر زخم آیا۔ آپ نے بالاخانہ میں تنہا نشینی اختیار کر لی۔ واقعات کے قرینہ سے لوگوں نے خیال کیا کہ آپ نے تمام ازواج کو طلاق دیدی ہے"۔

(سیرۃ النبی جلد اول ص ۵۵۱)

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:-

"یہ عجیب بات ہے کہ پیغمبر اسلام جن سے واقعہ کی نسبت ہے وہ موجود ہیں اور لوگ محض ایک مہینہ کی علیحدگی سے یہ قیاس کر کے مشہور کر دیتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے طلاق دیدی ہے۔ حالانکہ رسالت مآب بظاہر موجود ہیں۔ بڑے سے بڑے صحابی بھی محض غلط فہمی کی بنا ء پر آپس میں تذکرہ کرتے نظر آتے ہیں۔ آخر حضرت عمر کو یہ بات سوجھی اور انھوں نے ہمت کر کے آنحضرتؐ سے استفسار کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ میں نے طلاق نہیں دی۔ حضرت عمر نے عرض کیا کہ مسجد میں تمام صحابہؓ مغموم بیٹھے ہیں اجازت ہو تو اُن کو جا کر خبر کر دوں کہ یہ واقعہ غلط ہے۔ چونکہ ایلاء کی مدت ایک مہینہ گزر چکا تھا آپ بالاخانہ سے اُتر آئے اور عام باریابی کی اجازت دی"۔

(سیرۃ النبی جلد ۱ ص ۵۵۴)

مقامِ شکر ہے کہ حضرت عمرؓ نے ہمت کرکے پوچھ لیا ورنہ معاملہ اگر یونہی رہتا اور آنحضرتؐ اس واقعہ کو خود غلط نہ قرار دیتے تو آج تک یہی مشہور رہتا کہ آنحضرت نے ازواجؓ کو طلاق دیدی تھی۔

ایسے ہی واقعۂ افک بھی بے بنیاد نظر آتا ہے۔ یعنی جس واقعہ میں ام المؤمنین پر تہمت لگائی گئی تھی حالانکہ یہ واقعہ اصل حقیقت سے بہت دُور تھا۔ یونہی منافقین نے مشہور کر دیا اگر بذریعۂ وحی اس اتہام کی تردید نہ ہوتی تو ایک عظیم فتنہ رُونما ہو چکا تھا۔ اور لُطف کی بات تو یہ ہے کہ بڑے بڑے صحابہ بھی اس میں ملوّث ہو چکے تھے۔ خدا کا شکر ہے کہ قرآن نے معاملہ کو صاف کر دیا ورنہ یہ پروپیگنڈا امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ آج ہمہ گیر شہرت حاصل کر چکا ہوتا۔ اور مسلمان دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہ ہوتے۔

علامہ شبلی نے اپنی ناقدانہ بصیرت کے انداز میں اس حقیقت کو اپنے الفاظ میں یوں تحریر کیا ہے:۔

"مدینہ میں منافقین کا ایک گروہِ کثیر موجود تھا۔ جن کی تعداد چار سو تک بیان کی گئی ہے۔ یہ شریرالنفس ہمیشہ تاک میں لگے رہتے کہ کسی تدبیر سے آنحضرتؐ اور اُن کے خاندان و رفقاء میں پھوٹ ڈالی جائے۔ افک کے واقعہ میں ان کو کامیابی کی جھلک نظر آچکی تھی۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم پندرہ دن تک حضرت عائشہ سے کبیدہ خاطر رہے۔ حضرت حسّان افک میں شریک ہو گئے تھے۔ آنحضرتؐ کی سالی حضرت حمنہ جو حضرت زینب کی بہن تھیں سازش میں آ گئی تھیں۔ چنانچہ اس روایت کو علانیہ شہرت دیتی تھیں۔ حضرت ابوبکر نے اپنے ایک قریبی عزیز (مسطح) کو جو شریکِ تہمت تھے مالی اعانت سے محروم کر دیا تھا۔ اگر حضرت عائشہ کی براءت پر وحی نہ آجاتی تو ایک فتنۂ عظیم برپا ہو چکا تھا۔ ان واقعات میں کذابین

رواۃ نے اس قدر تلبیسات اور خداعیاں کی ہیں کہ بڑے بڑے مورخین و ارباب سیر نے یہ روایتیں اپنی تصانیف میں اسناداً درج کر دیں۔"

(سیرۃ النبی جلد اول ص۵۵)

ہماری پیش کردہ مثالی تصریحات سے یہ بات اچھی طرح روشن ہو گئی ہے کہ بناتِ رسولؐ کے تعدد کا مسئلہ۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ثیبہ ہونے کا افسانہ۔ جناب اُمِّ کلثوم بنت علیؑ کے عقد کا قضیہ۔ ازواجِ رسول کے مطلقہ ہونے کا معاملہ۔ افک عائشہ کے متعلق مَن گھڑت بہتان اور فتنۂ ارتداد و مالک بن نویرہ کے قتل کا پس منظر وغیرہ ایسے فرضی اور وضع کردہ افسانے ہیں جو کسی صورت میں بھی روایت و درایت کے اصولوں پہ پورے نہیں اُترتے۔ یہ سب باتیں یا تو غلط فہمی کا شکار ہوئیں۔ یا پھر سیاسی مزاجوں نے انھیں غلط رنگ میں پیش کر کے شہرت دیدی ہے۔

اِن تمام واقعات کو تمثیل کے طور پہ پیش کرنے سے ہمارا مطلب یہ تھا کہ چند دنوں کا پروپیگنڈا اور ایک غلط بات کی اشاعت جھوٹ کو سچ بنا سکتی ہے۔ اور اگر اس سلسلہ میں چند سال اور اس کے بعد چند صدیاں بھی اسی نشر و اشاعت میں گزر جائیں اور مزید برآں حکومتوں کی مشینری بھی اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتی رہی ہو تو بھلا کیا کچھ نہ ہو سکتا تھا۔

ان ہی واقعات سے ملتا جُلتا ایک اور افسانہ تاریخ اسلام میں پایا جاتا ہے۔ جس کے متعلق تاریخی تجزیہ درایت کے اصولوں کے ماتحت کرنے کے لئے ہم نے یہ تالیف پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔ ہم آئندہ مباحث میں تفصیلاً بیان کریں گے کہ کس طرح رواۃ اور مورخین نے اپنی اس مفروضہ داستان کو اعتبار کا قالب دیکر اپنے ذہنی انتشار کو سکون عطا کرنے کی کوشش کی۔ اس بے جوڑ کہانی کا عنوان ہے "عبداللہ بن سبا"۔

تقریباً ایک ہزار برس سے مورخین ابنِ سبا کے متعلق بہت کچھ لکھتے آرہے ہیں

اور نہایت ہی وحشت خیز امور ابن سبا اور سبائیین کے متعلق بیان کرتے چلے آئے ہیں حالانکہ صحیح تاریخ میں ان کا کوئی مقام نہیں تھا۔ آج بھی جس اہلِ قلم کو شوقِ تصنیف دامن گیر ہوتا ہے وہ کسی کے تعاقب کا اندیشہ کئے بغیر اپنے موضوعِ بحث میں اہلِ اسلام کی ایک اہم مذہبی تنظیم کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کرنے کے لئے ابن سبا کے قصّہ کو ہی عنوان قرار دیتا ہے۔

قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قصّہ اور افسانہ کے وضاعین کے دل میں یہ خیال کیونکر پیدا ہوا؟ تو جب ہم تاریخ اسلام کے مطالعہ سے صدرِ اوّل کے مسلمانوں میں باہمی جنگ و جدال اور اختلافات و مناقشات کے واقعات پر غائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت عثمان کے قتل اور جنگِ جمل وغیرہ کے واقعات میں جن اربابِ اقتدار اور ملتِ اسلامیہ کے اکابرین کے متعلق بدگمانی پیدا ہو جانے کا یقین تھا ان کے حالات کو محجوب رکھنے اور شیعیت میں یہودیت کا عنصر داخل کرنے کے لئے یہ بات بنائی گئی کہ ابنِ سبا مِن کا یہودی تھا۔ جو زمانۂ خلافتِ عثمانیہ میں منافقانہ طور پر مسلمان ہوا۔ اس نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لئے غلط عقائد کی نشر و اشاعت کی اور اپنے پروپیگنڈے سے حضرتِ عثمان ایسے ہر دل عزیز حاکم کو خود مسلمانوں کے ہاتھوں ہی مروا ڈالا۔ اور بعد میں حضرت علی المرتضیٰؑ کے ہاتھ پر بیعت کروا کر جنگِ جمل کا سیاسی اکھاڑا بھی اسی بدبخت یہودی نے قایم کیا۔ غرضیکہ مورخین نے ابن سبا کے متعلق ایسی حیرت انگیز باتیں بیان کی ہیں کہ جن کا تذکرہ ہم اس مقام پر کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔ کتاب کے آئندہ صفحات میں ہم ان کو ذرا تفصیل کے ساتھ پیش کر کے ان پر نقد و تبصرہ کرنے کے بعد یہ ثابت کریں گے کہ بالفرض ابن سبا اگر کوئی شخصیت تھی بھی تو اس کی اہمیت اس قدر نہ تھی جتنا کہ یہ لوگ بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔

عہدِ حاضر کے نامور ادیب اور فلسفی مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری اس رازِ سربستہ

کا انکشاف اِن الفاظ میں پیش کرتے ہیں :-

" ابنِ سبا بالکل فرضی اور مَن گھڑت چیز ہے ۔ اور جب فرقہ شیعہ اور دیگر اسلامی فرقوں میں جھگڑے چل رہے تھے تو اس وقت اسے جنم دیا گیا ۔ شیعوں کے دشمنوں کا مقصد یہ تھا کہ شیعوں کے اصولِ مذہب میں یہودی عنصر داخل کر دیا جائے ۔ یہ سب کچھ بڑی چالبازی اور مکر و فریب کی صورتیں تھیں ۔ محض شیعوں کو زِچ کرنے کے لئے ۔ امویوں اور عباسیوں کے دورِ حکومت میں شیعوں کے دشمنوں نے عبداللہ بن سبا کے معاملہ میں بہت مبالغہ آمیزی سے کام لیا ۔ اس کے حالات بہت بڑھا چڑھا کر بیان کئے ۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ تھا کہ حضرت عثمان اور ان کے عمّالِ حکومت کی طرف جن خرابیوں کی نسبت دی جاتی ہے اور ناپسندیدہ باتیں جو اُن کے متعلق مشہور ہیں کو سُن کر لوگ شک و شبہ میں پڑ جائیں ۔ دوسرا فائدہ یہ کہ علیؑ اور اُن کے شیعہ لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہوں ۔ نہ معلوم شیعوں کے دشمنوں نے شیعوں پر کتنے غلط الزامات لگائے ، اور نہ جانے شیعوں نے کتنی غلط باتیں اپنے دشمنوں کی طرف عثمان وغیرہ کے معاملہ میں منسوب کیں "

(الفتنۃ الکبریٰ جلد اوّل ص۱۳۲ مطبوعہ مصر)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصر کے اُن فضلاء اور اساطینِ علم میں سے ہیں ، جن کی آزادانہ مذہبی و تاریخی تحقیقات نے عالمِ اسلام میں تہلکہ مچا رکھا ہے ۔ اور ان کی وہ تحقیقی تصنیفات علمی دنیا میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں ۔ حضرت عثمان کے حالات پر جو انھوں نے تاریخی تبصرہ کیا ہے ہم اُسے آئندہ اوراق میں پیش کریں گے ۔

ان کے علاوہ حوزہ علمیہ نجف کے نامور محقق علّامہ شیخ محمد حسین آلِ کاشف الغطا

جن کے علمی تبحّر کا لوہا تمام علمی دنیا تسلیم کر چکی ہے نے بھی ایک مقام پر عبداللہ بن سبا کی داستان کے متعلق اشارۃً ذکر کیا ہے۔ اُن کے اپنے الفاظ اس طرح ہیں:۔

"اس سلسلہ میں بعض حضرات کی یہ رائے ہے کہ عبداللہ بن سبا مجنون عامری اور ابوہلال وغیرہ داستان سراؤں کے خیالی ہیرو ہیں۔ اموی اور عباسی سلطنتوں کے وسطی دور میں عیش وعشرت اور لہو ولعب کو اتنا فروغ حاصل ہو گیا تھا کہ فسانہ گوئی محل نشینوں اور آرام طلبوں کا جزوِ زندگی بن گئی۔ چنانچہ اس قسم کی کہانیاں بھی ڈھل گئیں۔"

(اصل و اصول شیعہ ص۲۵)

مورخین نے جس غرض کے لیے اس بات کو وضع کیا تھا وہ غرض اُن کی کسی حد تک ضرور پوری ہو گئی۔ روایات کی اندھا دھند تقلید کرنے والے بلاشبہ اس افسانہ کو حقیقت سمجھ بیٹھے اور حضرت عثمان وغیرہ کے ساتھ عقیدت رکھتے ہوئے فتنۂ کبریٰ کے تمام واقعات کو عبداللہ بن سبا کے ہی سر منڈھتے ہیں۔ مگر جن اربابِ نظر اور اصحابِ فکر کو قدرت نے فطری طور پر ذوقِ تحقیق عطا کیا ہے وہ واقعہ کی تہ تک پہنچ چکے ہیں۔ خلافِ درایت و روایت افسانوں کو وہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری۔ مرتضیٰ الحسن عسکری نجف عراق اور مدیر اصلاح کھجوہ وغیرہ فضلاء اعلام اپنے اپنے مصنفات میں ابن سبا کے عنوان سے مستقل بحثیں کر کے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ یہ ایک فرضی وجود اور خلافِ عقل و نقل افسانہ ہے۔ ہماری یہ پیشکش بھی اسی سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے جو انہی بزرگوں کی تحقیقات سے استفادہ کر کے ترتیب دی جا رہی ہے۔

ہم آگے چل کر یہ بات ثابت کریں گے کہ ابن سبا کا قصہ سب سے پہلے سیف ابن عمر راوی نے وضع کیا جس نے ہارون الرشید کے زمانہ میں انتقال کیا اور یہ کہ وہ متفقہ طور پر ائمہ رجال کے نزدیک افسانہ گو اور متہم بالکذب ہے۔

اسی سیف سے مورّخ طبری نے نقل کیا اور طبری کے بعد ابن اثیر ہوں یا ابوالفداؔ ابن کثیر ہوں یا عہدِ قریب کے مورخین حسن ابراہیم اور احمد امین وغیرہ یا ان کے خوشہ چین مستشرقینِ یورپ سب کے سب طبری سے ہی اس قصہ کو نقل کرتے ہیں۔ طبری سے پہلے کا تاریخی مواد اس ذکر سے بالکل خالی ہے۔ متقدمین نے تو بطورِ روایت اس قصہ کو نقل کیا مگر متاخرین حقیقت سمجھ بیٹھے۔ آج تک جن لوگوں نے ابن سبا کے ذکر کو تحریر کیا ہے انھوں نے اسے دیگر واقعات کے ذیل میں درج کیا۔ مگر عصرِ حاضر میں ایک مجہول الاسم مصنّف نے تو ایک مستقل کتاب (فتنۂ ابن سبا) کے نام سے تحریر کر ڈالی۔ یہ کتاب پہلے لکھنؤ سے شائع ہوئی اور اب مکتبۂ صدیقیہ ملتان نے دوبارہ اسے "تاریخِ مذہب شیعہ" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔

فاضل مصنّف نے یہ کتاب اپنے خیال کے مطابق غیر جانبداری اور مخلصانہ جذبات کے ماتحت لکھی ہے۔ مگر جس شخص کو اس کتاب کے دیکھنے اور پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے اُسے معلوم ہو گا کہ نام نہاد مصنّف نے کس قدر اتہام تراشی اور افترا پردازیوں سے کام لیکر جادۂ اعتدال سے انحراف کیا ہے۔ اور یہ کہ امانت و دیانت کی قدروں کو نظر انداز کرتے ہوئے کس طرح اہلِ اسلام کی ایک مسلّمہ مذہبی جماعت پر سوقیانہ حملے کئے ہیں۔ اور شیعی معتقدات کو اس انداز میں پیش کیا کہ خدا کی پناہ!

چنانچہ پیشِ نظر تالیف میں جہاں دیگر مورخین کی الزام تراشیوں کو طشت ازبام کیا گیا ہے وہاں اس کتاب کے مندرجات کا بھی تاریخی تجزیہ پیشِ نظر رہا ہے۔

مؤلف

خلافتِ عثمانیہ پر ایک نظر

حضرت عمر بن خطاب کی وفات کے بعد سلطنتِ اسلامیہ کی باگ ڈور کس کے سپرد کی جائے؟ اس کا فیصلہ ایک کمیٹی (مجلسِ شوریٰ) نے کیا۔ جس کے اراکین حضرت عمر کی سیاسی بصیرت نے خود ہی منتخب کیے تھے۔ اور وہ یہ ہیں:-

۱- علیؓ ابنِ ابی طالبؑ۔ ۲- عثمان بن عفان۔ ۳- عبدالرحمٰن بن عوف
۴- سعد بن ابی وقاص۔ ۵- طلحہ بن عبیداللہ۔ ۶- زبیر بن عوام۔

انتخابِ خلافت کی مہم کو سر کرنے کے سلسلے میں حضرت عمر ایسے سیاسی حکمران کی یہ وصیت تھی کہ میرے بعد تین روز تک صلاح و مشورہ کرنا اور انہی چھ اراکین میں سے کسی ایک کو خلیفہ بنا لینا۔ اور اگر کوئی رائے کامیاب نہ ہو تو میرے فرزند عبداللہ کو ثالث بنانا، اور اگر اس پر بھی رضامندی نہ ہو تو جس گروہ میں عبدالرحمٰن بن عوف ہو اُس کے ساتھ ہو جانا۔ اور بقیہ مخالفین کو بصورتِ عدم تسلیم قتل کر دینا۔

چنانچہ حضرت عمر کی وفات کے بعد تین روز تک انتخابِ خلافت کی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں، مگر کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ بالآخر علیؓ اور عثمان کے علاوہ سارے امیدوار دعوئ خلافت سے دست بردار ہو گئے اور عبدالرحمٰن بن عوف کو اختیار دیا گیا کہ وہ فیصلہ کریں۔ (طبری جلد ۲ ص ۲۹۴)

اب صدرِ مجلس عبدالرحمٰن بن عوف تھے۔ ان کی نظر میں علیؓ ابنِ ابی طالب اور عثمان بن عفان ہی دو ایسی شخصیتیں تھیں جو اس عہدۂ جلیلہ کے لئے مناسب تھیں۔ مگر حضرت عثمان کے ساتھ قرابت داری کی وجہ سے ابن عوف کا ذاتی میلان قدرے زیادہ تھا۔ چنانچہ بڑے غور و فکر کے بعد انھوں نے ایک تجویز مرتب کی کہ ان دو حضرات

میں سے جو اسے قبول کرے اسے سلطنتِ اسلامیہ کا سربراہ تسلیم کر لیا جائے۔ وہ یہ کہ ہونے والے خلیفہ کو "کتاب اللہ، سنّتِ رسولؐ اور سیرتِ شیخین پر عمل کرنا لازمی ہوگا۔

حضرت علی المرتضیٰؑ نے مجلسِ شوریٰ کی اس شرط کے پہلے دو جزو یعنی کتاب اللہ وسنّتِ رسولؐ پر عمل کرنے کا تو اقرار فرمالیا مگر تیسرے جزو "سیرتِ شیخین" (ابوبکر و عمر) پر کاربند ہونے سے صریحاً انکار کر دیا۔ لیکن حضرت عثمان نے بلا پس و پیش اس مجوزہ سکیم کی شرط کے تینوں اجزاء منظور کر لئے۔ لہٰذا حکومتِ اسلامیہ کی باگ ڈور انہی کے ہاتھ میں دیدی گئی۔ (تاریخِ طبری جلد ۳ صـ ۲۹۷ ۔ تاریخِ کامل جلد ۳ صـ ۲۶)

حضرت عثمان کے ابتدائی دورِ خلافت میں نظامِ مملکت قریب قریب اسی نہج پر چلتا رہا جیسا کہ سابقہ دو خلافتوں میں تھا۔ حضرت عمر کے دور کے تجربہ کار اور صائب الرائے حکّام جو جلیل القدر صحابی بھی تھے مختلف ذمہ داریوں کو نبھاتے چلے آ رہے تھے۔ جن میں عبداللہ بن مسعود۔ عمار بن یاسرؓ۔ عمرو ابن عاص۔ ابو موسیٰ اشعری۔ مغیرہ بن شعبہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مگر حضرت عثمان نے ان تمام کو معزول کر کے اُن کی بجائے اپنے ہی خاندان کے اُموی نوجوانوں کی بھرتی کر لی اور انھیں سلطنت کی کلیدی آسامیوں پر بٹھا دیا۔ حالانکہ تجربہ۔ تدبّر اور سبقتِ اسلام کے اعتبار سے اُن کا کوئی مقام نہ تھا۔ رعایا پر قابو پانے اور سلطنت کی میخیں بنو اُمیّہ کو قرار دینے کے لئے انھوں نے اسی بات کو مناسب سمجھا کہ اپنے اعزّہ و اقارب کو امورِ سلطنت تفویض کر دیئے جائیں۔

(روضۃ الصّفا۔ جلد ۲ صـ ۱۴۷)

چنانچہ اسی بنا پر انھوں نے حکم بن عاص اموی جسے حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے مدینہ سے جلاوطن کر دیا تھا اور حضراتِ شیخین نے بھی آنحضرتؐ کے فیصلہ کا احترام کرتے ہوئے اسے جلاوطن ہی رکھا کی جلاوطنی منسوخ کر کے اُسے واپس مدینہ بلالیا۔ مزید برآں اس کے فرزند مروان کو قلمدانِ وزارت بھی عطا فرما دیا۔

(عقد الفرید جلد ۲ صـ ۲۷۲)

ع "رموزِ سلطنتِ خویش خسرواں دانند"

کے اعتبار سے ہم اُن کے اِس فعل پر رائے زنی نہیں کرنا چاہتے۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ حضرتِ عثمان کا یہ اقدام سُنّتِ رسولؐ اور سیرتِ شیخین کے خلاف تھا۔ اور یہی ایک ابتدائی واقعہ پبلک کے اشتعال کا باعث ہوا۔ مورخین کے بیان کے مطابق آگے چلکر یہی اقدام حضرت عثمان کے قتل کا باعث بھی ہوا۔

حکومت کو داخلی خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے رعایا کے بعض سر برآوردہ طبقات کے وقار کو ختم کرنے کی غرض سے اُن کی اقتصادی حالت کمزور کرنیکی کوشش کی جاتی ہے اور بعض موالفین کی کمزور حالت کو بہتر بنانا پڑتا ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان نے بھی سلطنت کے استحکام کی خاطر اسی اصول کو اپناتے ہوئے بنو ہاشم یا دیگر صحابہ کرامؓ کا تو ذکر ہی کیا، اُمّہات المؤمنین کے وظائف کو بھی کم کرایا اور اپنے قرابتداروں اور دَم بھرنے والوں کو اطرافِ ملک میں جاگیریں عطا کر کے اُن کی حالت کو بہتر بنایا۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری حضرت عثمان کے نظامِ مالیات پر تبصرہ کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں:۔

"انھوں نے مروان بن حکم کو افریقہ میں مسلمانوں کے حاصل کردہ مالِ غنیمت کا ۱/۵ حصہ بخش دیا اور اپنے چچا حکم کو دولت سے نوازا۔ حکم کے بیٹے حارث کو تین لاکھ۔ عبداللہ بن خالد بن اسید اموی کو تین لاکھ اور عبداللہ بن خالد کے ہمراہیوں کو ایک ایک لاکھ درہم بخشے۔ حتیٰ کہ بیت المال کے خزانچی عبداللہ بن ارقم نے تعمیل حکم سے انکار کر دیا اور اپنے منصب سے مستعفی ہوگئے۔ عبداللہ بن ارقم کے مستعفی ہونے کے بعد خود اُن کو تین لاکھ درہم عطا کیئے مگر انھوں نے اپنے زہد و تقویٰ کی بنا پر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی طرح حضرت عثمان نے حضرت زبیر بن عوامؓ کو چھ لاکھ اور حضرت طلحہ بن عبیداللہ اور حضرت سعد بن وقاص کو ایک ایک

لاکھ درہم دیئے۔ اپنی تین یا چار بیٹیاں قریش میں بیاہیں اور ان میں سے ہر ایک کے شوہر کو ایک ایک لاکھ درہم تفویض کیے۔"

(الفتنۃ الکبریٰ اردو، جلد اول صفحہ ۲۲۳)

ظاہر ہے کہ حضرت عثمان کے پیدا کردہ اقتصادی انقلاب سے پہلی دفعہ عالمِ اسلام میں سرمایہ دارانہ نظام کی ابتداء ہوئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ صحبتِ نبویؐ کے فیض یافتہ مسلمان اِن خسروانہ عنایات کو برداشت نہ کر سکے، چنانچہ بعض حلقوں میں شدید احتجاج کے آثار نمایاں ہوئے۔ مگر ان کو دبانے کے لئے بہترین علاج یہ تجویز کیا گیا کہ اگر ملک کے کسی کونے سے اشارتاً یا علانیہ کوئی آواز بلند ہوئی تو بلا رعایت کہ وہ آواز بلند کرنے والا جلیل القدر صحابی ہی کیوں نہ تھا اس کو عبرتناک سزا دی گئی۔ جیسا کہ حضرت ابوذر غفاریؓ، عمار بن یاسرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ مشاہیر صحابہ کے دردناک سوانح حیات ہمارے اس دعوے کے شاہد ہیں۔

یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ حدِ اعتدال سے متجاوز ہونا آخر وبالِ جان بن جاتا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور چاروں طرف سے حضرتِ عثمان پر نکتہ چینیاں شروع ہو گئیں۔ صحابۂ کرام کے ساتھ ناروا سلوک عوام و خواص کے اشتعال کا موجب بنا۔ محمدؒ بن ابوبکر جنھیں گورنرِ مصر بنا کر بھیجا گیا کے خلاف خود مرکزی حکومت کی طرف سے ہی ایک عظیم سازش جلتی پر تیل کا کام کر گئی۔ امّ المؤمنین حضرت عائشہ کی برافروختگی احتجاج کرنے والوں کا بہترین سہارا ثابت ہوئی۔ اور ان بگڑے ہوئے حالات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ صبر کے پیمانے لبریز ہو گئے۔ حالات پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ بالآخر دار السلطنت مدینہ کے اندر ہی مقتدر صحابۂ کرامؓ کی موجودگی میں خلیفۂ وقت کو چالیس دن تک محصور کر کے خود مسلمانوں نے ہی قتل کر دیا۔ اکابر صحابہ مہاجرین و انصار نے کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جس سے خلیفۂ اسلام کی جان بچ جاتی۔

یہ فتنہ و فساد کے واقعات تاریخ کی ہر کتاب میں ملتے ہیں۔ اور کتب احادیث میں کتاب الفتن کے عنوان سے موجود ہیں۔ اور یہ حقائقِ تاریخیہ اتنے مسلّم الثبوت ہیں کہ کسی کو بھی انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ یہی وہ علل و اسباب ہیں جن کی بنا پر قتلِ عثمان کا ناگوار حادثہ رُونما ہوا، اور یہی وہ تلخ واقعات ہیں جن پر پردہ پوشی کے لئے ابتداء سے ہی جد و جہد چلی آ رہی ہے۔ یہ کیوں؟ اور کس لئے؟ محض اِس واسطے کہ اگر ان اسباب و علل کا تذکرہ کھلے الفاظ میں کیا جائے تو قرونِ اُولیٰ کے اکابرینِ ملّت کے متعلق حسن عقیدت کے جذبات ختم ہو کر رہ جاتے ہیں اور اُن کے متعلق بدگمانی پیدا ہو جانیکا قوی یقین ہے۔ ان واقعات سے نہ صرف صحابہ کرام کی آپس میں جنگ و جدل، حرصِ سرداری اور طمعِ ریاست و ملک گیری واضح ہوتی ہے بلکہ ان کے کردار پر بھی ضرب کاری لگتی ہے۔ لہٰذا ان واقعات کے محجوب رکھنے کو ہی حسنِ عقیدت اور ایمان کی سلامتی سمجھی گئی۔ خود صدر المتکلمین علاّمہ تفتازانی نے بھی شرح مقاصد جلد ۲ صفحہ ۲۰۶ میں ان حقائق کو اعترافاً تحریر فرمایا ہے۔ اربابِ تحقیق ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

جب حقائق اتنے واضح اور آشکار ہوں کہ جن سے انکار مداہنت کا انکار ہے تو ان الزامات اور مطاعن کو جو اکابرین صحابہ پر عائد ہوتے ہیں۔ اُن کے دامن سے صاف کرنے کے لئے کسی ایسی سبیل کو تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی جس کی وجہ سے بعد والی نسلوں کو یہ باور کرایا جا سکے کہ ان تمام فتنوں اور منقلب حالات کا صدور اگرچہ انہی بزرگوں سے ہوا مگر حقیقتاً ان برگزیدہ لوگوں کو مکر و فریب کے جال میں پھنسا کر فسادات پر آمادہ کیا گیا۔

مورخینِ اسلام نے ایسی شخصیت کو جس نے صحبتِ رسولؐ سے فیض یافتہ اور قرآن و حدیث کے مخاطبینِ اوّلین کو ملّتِ اسلامیہ کی بیخ کنی کا درس دیا "عبد اللہ بن سبا" کے فرضی نام سے تعبیر کر کے اوراقِ تاریخ میں جگہ دی۔ تاکہ اپنے مقاصد

کی کامیابی کا سامان فراہم کیا جا سکے۔ اس لئے داستان سرا رواۃ اور رطب و یابس جمع کرنے والے مورخین نے داستان الف لیلہ سے ملتی جلتی ایک کہانی تصنیف کر ڈالی اور ایک خیالی انسان پیدا کر کے سارے الزامات اُس کے سر منڈھ دیئے کہ جو کچھ کیا اِسی نومسلم یہودی نے کیا۔ اگر یہ مسلمان ہو کر فتنوں کے دروازے نہ کھولتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عثمان کی نرم مزاج پالیسی سے اُس نے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جامعۂ اسلامیہ کی یکجہتی کو آنِ واحد میں منتشر کر دیا۔ "عبداللہ بن سبا" کی سرگرمیاں ملک کے طول و عرض پر چھا گئیں۔ اُس کی تقریروں نے عوام اور خواص کو اپنے جادو میں لے لیا۔ سیاستِ وقت کو اُس نے ہر مقام پر چیلنج کیا اور مسلمانوں کی غالب اکثریت اس کے ہمنوا ہو گئی۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ مسیح اسلام ابوذر غفاری رض ایسا زاہد صحابی بھی اس کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ نہ رہ سکا۔ وہ اس قدر اقتدار حاصل کر گیا کہ خود تو مصر میں بیٹھا رہا، مگر مصر، کوفہ، بصرہ اور مدینہ کے لوگوں نے اُس کے اشاروں پر مرکزِ خلافت میں ہی عظیم الشان سلطنتِ اسلامیہ کے سربراہ حضرت عثمان کو قتل کر دیا۔ اِس بے جوڑ کہانی اور مفروضہ داستان کے خیالی ہیرو "عبداللہ بن سبا" کے متعلق مورخین کے تفصیلی بیانات ملاحظہ فرمائیے۔

مورخین اور ابن سبا

صاحب تاریخ الامم والملوک علامہ ابن جریر طبری تحریر فرماتے ہیں :-

" ابن سبا صنعا (یمن) کا ایک یہودی تھا، جو خلافت عثمانیہ میں اسلام لایا اور مسلمانوں میں گھل مل گیا۔ ممالکِ اسلامیہ اور بلادِ اسلامی مثلاً کوفہ، بصرہ اور شام میں اس نے پروپیگنڈا کیا کہ جس طرح حضرتِ عیسیٰؑ دوبارہ دنیا میں آئیں گے اسی طرح ہمارے پیغمبر دوبارہ تشریف فرما ہوں گے۔ جس طرح ہر نبی کا وصی ہوتا ہے اسی طرح آنحضرتؐ کے وصی علیؑ ابنِ ابی طالبؑ ہیں جو کہ خاتم الاوصیا ہیں۔ عثمان غاصب ہیں۔ انھوں نے وصیِ پیغمبر کا حق غصب کیا، لہٰذا اُن سے جنگ کرنا واجب ہے تاکہ حقدار کو حق مل جائے۔

چنانچہ ابنِ سبا نے اس تحریک کے سلسلہ میں بلادِ اسلامیہ میں اپنی طرف سے پروپیگنڈا کرنے والے بھیجے اور انھیں سمجھایا کہ وہ ظاہراً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنا مشغلہ بنائیں اور مخفی طور پر عوام کو حکومت کے خلاف برانگیختہ کریں۔ چنانچہ سبائین جہاں بھی ہوتے وہاں کے حکام کے خلاف عوام کو نفرت دلاتے اور حکام کے عیوب کا پروپیگنڈا بذریعۂ خطوط دوسرے بلاد میں کرتے۔

ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے بھڑکانے سے مسلمانوں کی بہت سی جماعتیں حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوئیں اور مدینہ پر چڑھ دوڑیں، اور حضرت عثمان کا محاصرہ کر کے انھیں قتل کر دیا۔"

(تاریخ طبری جلد ۳ ص ۳۷۸ - ۳۷۹ - البدایۃ النہایہ علامہ ابن کثیر جلد ۷ ص ۱۶۷ - تاریخ ابوالفداء

صاحب تاریخِ کامل علّامہ ابنِ اثیر جنگِ جمل کے تذکرہ میں یوں ارشاد فرماتے ہیں:-

"جب مسلمانوں نے حضرت علیؓ کی بیعت کرلی اور طلحہ و زبیر جنگِ جمل کے لئے بصرہ چلے گئے۔ سبائیین نے دیکھا کہ دونوں لشکروں کے سردار باہمی سمجھوتے کی کوشش کر رہے ہیں، اگر یہ سمجھوتہ ہوگیا تو لامحالہ سبائیین ہی حضرت عثمان کے قتل میں ماخوذ ہوں گے تو انھوں نے رات کو جمع ہو کر طے کیا کہ دونوں لشکروں میں سازش کا جال بچھا دیا جائے اور صبح سویرے جنگ چھیڑ دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا"۔

(تاریخِ کامل۔ جلد ۳ صـ ۹۶-۹۵)

علّامہ رشید مدیر "المنار" مصر تحریر فرماتے ہیں:-

"شیعیت کے اصول ایک یہودی عبداللہ بن سبا نے گھڑے جس نے مکر و فریب سے کام لیکر اسلام ظاہر کیا اور لوگوں کو حضرت علیؓ کے بارے میں غلو کی دعوت دی۔ غرض یہ تھی کہ اُمّتِ اسلام میں پھُوٹ پڑ جائے اور مسلمانوں کی دین و دنیا غارت ہو جائے"۔

(کتاب السنۃ والشیعہ صـ ۶)

ڈاکٹر حسن ابراہیم مصری کا بیان ہے:-

"یہ فضا انقلاب کے لئے پوری طرح سازگار اور عبداللہ بن سبا اور اُس کے پیروؤں کی باتوں کو قبول کرنے اور متاثر ہونے کے لئے انتہائی حد تک تیار تھی۔ اس ہنگامہ کی آگ ایک جلیل القدر و عظیم المرتبت صحابی نے بھڑکائی جو سابقین میں سے تھے، اور زہد و پرہیزگاری میں مشہور اور بزرگ ترین ائمہ حدیث سے تھے۔ یعنی حضرت ابوذر غفاریؓ جنھوں نے عبداللہ بن سبا کی باتوں میں آکر حضرت عثمان اور اُن کے گورنر معاویہ

کی سیاست کو چیلنج کیا تھا۔

یہ عبداللہ بن سبا صنعا کا رہنے والا ایک یہودی تھا جو مسلمان ہو گیا تھا۔ اس نے ممالکِ اسلامیہ کے دورے کئے۔ ابتدا اس نے حجاز سے کی، پھر بصرہ آیا، اس کے بعد کوفہ اور کوفہ سے شام و مصر گیا"

(تاریخ الاسلام السیاسی ص۳۴۷)

علامہ احمد امین فاضل مصر حضرت عثمان کے دور میں فتنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :-

"ابن سبا حضرت ابوذرؓ سے ملا اور اپنے خیالات و نظریات اُن کے سامنے پیش کئے۔ یہ ابن سبا ابودردا اور عبادہ بن صامت کے پاس بھی پہنچا، مگر انھوں نے اُس کی باتوں پر کان نہ دھرے۔ عبادہ اُسے معاویہ کے پاس پکڑ کر بھی لے گیا کہ اِس نے تمھارے خلاف ہنگامے برپا کئے۔ ہم جانتے ہیں کہ ابن السودا (یہ عبداللہ بن سبا کا ایک لقب بھی رکھا گیا ــــ مؤلف) جو صنعا کا یہودی تھا عہدِ عثمان میں اُس نے اسلام ظاہر کیا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ مسلمانوں کے دین کو غارت کرے اُس نے شہروں میں بہت سے مُضر اور نقصان رساں عقائد کی اشاعت کی جنھیں ہم بعد میں بیان کریں گے۔ اس نے بہت سے شہروں کا سفر کیا۔ لہٰذا قوی احتمال اس کا ہے کہ اُس نے یہ خیالات و نظریات یمن کے مزدکیوں سے حاصل کئے ہوں۔ اور جناب ابوذرؓ خلوصِ نیت کے سبب ابنِ سبا کی باتوں میں آگئے ہوں۔

حضرتِ عثمان کے آخری زمانہ میں خفیہ جماعتیں حضرت عثمان کو معزول اور اُن کی جگہ پر دوسرا خلیفہ مقرر کرنے کے لئے تمام ممالک

میں پھیلیں۔ انہی جماعتوں میں ایک وہ جماعت بھی تھی جو حضرت علیؓ کو خلیفہ مقرر کرنے کے لئے کوشاں تھی۔ اس جماعت کا سرگرم رکن عبداللہ بن سبا تھا یہ شخص حضرت عثمان کے مخالفین میں سب سے سخت و شدید تھا۔ یہاں تک کہ حضرت عثمان قتل کر ڈالے گئے۔" (فجر الاسلام ص ۱۳۶/۳۱۱)

تو بڑے مستشرقینِ یورپ جنھوں نے ملکر دائرۃ المعارف الاسلامیہ کو ترتیب دیا ہے وہ اپنی تحقیق یوں پیش کرتے ہیں :۔

" طبری اور مقریزی کی روایات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابنِ سبا جن چیزوں کی تبلیغ کرتا تھا اُن میں ایک چیز یہ تھی کہ حضرت محمد مصطفیٰؐ دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے، نیز وہ یہ بھی کہتا تھا کہ جس طرح ہر نبی کے لئے ایک وصی ہے اُسی طرح آنحضرتؐ کے وصی علیؑ ابنِ ابی طالبؑ ہیں .... یہ ابن سبا اُنہی لوگوں میں سے تھا جو مصر سے مدینہ حضرت عثمان کو قتل کرنے کے لئے گئے تھے۔" (دائرۃ المعارف الاسلامیہ جلد ۱ ص ۲۹)

لغت کی مشہور کتاب " انسائکلوپیڈیا برٹانیکا " میں ابنِ سبا کا یوں ذکر کیا گیا ہے :۔

" Abdullah Bin Saba was a Sinian jew. He was an ulvi Mohamdan. He beleived that Ali was Mohammad's Successar. He was the fonder of Shia Sectar."

(INCICLAPADIA BARTANICA 1929)

(عبداللہ بن سبا صنعا کا ایک یہودی تھا، حضرت علیؑ کا طرفدار تھا،

اور اُنھیں پیغمبرؐ کا وصی سمجھتا تھا، شیعہ مذہب کا بانی سمجھا جاتا ہے۔)

(جامع اللغات اردو جلد۱ صـ۵۸۱ خواجہ عبدالمجید بی اے)

غرضیکہ جمہور مسلمین کے متقدمین علماء ہوں یا مورخین، یا پھر انہی کے ماخذوں پر اعتبار کرنے والے متاخرین ہوں، سب ہی نے عبداللہ بن سبا کے تذکرہ کو کسی نہ کسی رنگ میں پیش کیا ہے۔ اس حیرت انگیز مفروضہ داستان کے وضع کرنے کی غرض اگر اسی حد تک ہی رہتی کہ حضرت عثمانؓ اپنی کارروائیوں میں حق بجانب تھے اور اُن سے خلافِ دیانت و عدالت کوئی عمل ظہور پذیر نہیں ہوا تو جہاں اور بہت سے فرضی واقعات اور رطب و یابس مواد کو دیکھ کر متحمل مزاج انسان خاموش ہو کر محض خندۂ زیرلبی پہ ہی اکتفا کر لیتا ہے وہاں اس کہانی کو پڑھ لینے پر بھی شاید ایسا ہی ہوتا۔ مگر قیامت تو یہ ہے کہ ان ذمہ دار شخصیتوں نے سبائیت کا لیبل ہر اُس شخص پر چسپاں کر دیا ہے جو حضرت عثمانؓ سے خوش عقیدہ نہ تھا۔ بلکہ اُن کی فروگذاشتوں کا شاکی اور اپنی حق تلفیوں کا فریادی تھا۔ مالک اشترؓ، عدیؓ بن حاتم ایسے مقدس و زاہد جلیل القدر مومنین جو امیرالمومنین حضرت علیؑ ابنِ ابی طالبؑ کے دست و بازو تھے کے اسمائے گرامی اس فہرست میں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مگر اس حیرت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب یہ نظر آتا ہے کہ جناب ابوذر غفاری، عمار بن یاسر، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم وغیرہ صحابۂ کرام بھی اس میں شامل کئے گئے ہیں جو آسمانِ رسالت کے درخشندہ ستارے تھے۔

اب ہم تھوڑا بہت تاریخی تجزیہ کر کے ذرا اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کرنا چاہتے ہیں کہ تقریباً ایک ہزار برس سے جس فرضی شخصیت (عبداللہ بن سبا) کے متعلق مورخین نے بہت کچھ لکھ مارا، اور اس کے تابعین یعنی فرقہ سبائین کی طرف وحشت انگیز باتیں منسوب کی گئی ہیں کہاں تک لباسِ حقیقت میں ملبوس ہیں۔ اور اس فرضی تذکرہ کی ابتداء کب ہوئی؟

ابنِ سبا کے افسانہ کی ابتدا کہاں سے ہوئی

ابنِ سبا کے تذکرہ نویسوں اور افسانہ تراشوں نے اس کہانی کو قتلِ عثمان اور جنگِ جمل کے ضمن میں تو بڑی شد و مد سے پیش کیا ہے، مگر واقعۂ جمل کے بعد کامل سکوت نظر آتا ہے۔ ابنِ سبا کا انجام کیا ہوا؟ اور سبائی لوگ آخر گئے کہاں؟ جنگ کے بعد انھیں زمین کھا گئی یا آسمان؟ اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ حالانکہ چاہیئے تو یہ تھا کہ اتنی بڑی زبردست انقلابی پارٹی کا ذکر حدیث اور تاریخ کی ہر کتاب میں موجود ہوتا اور ہر ایک راوی اس شر انگیز گروہ کے کردار کو مذہبی فریضہ سمجھ کر امانت کے طور پر سلسلہ بسلسلہ بیان کرتا چلا آتا۔ مگر جب ہم تاریخ کی اس اہم فروگذاشت اور مغالطہ آمیزی کا تاریخی تجزیہ کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ متقدمین ہوں یا متاخرین مسلمان ہوں یا مستشرقین سب نے اس قصہ کو طبری سے ہی نقل کیا ہے۔ اس امر کے ثبوت میں کہ تمام مورخین اس داستان گوئی میں طبری کے ہی خوشہ چین ہیں خود انہی کے بیانات سے ہم ثابت کئے دیتے ہیں تاکہ ہمارا دعویٰ تشنۂ ثبوت نہ رہ جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک ہزار سال سے اس قصہ کی ابتدا ہوئی اور جوں جوں زمانہ گزرتا گیا اس کی اشاعت میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی۔ اب تو کوئی کتاب صحابہ کے حالات میں نہ لکھی جاتی ہوگی جس میں ابنِ سبا کا تھوڑا بہت تذکرہ موجود نہ ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ متقدمین نے بطور حدیث یا روایت اس کہانی کو بیان کیا۔ مگر متاخرین اسے ایک مسلمہ حقیقت خیال کر بیٹھے، اور بغیر واقعات کی چھان بین کئے نقل در نقل کرتے چلے آئے۔ اس قصہ کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ اور کیوں ہوئی؟ اس کے ماخذ کیا ہیں؟ کون راوی ہے؟ اور اُن کی حیثیت کتبِ رجال میں کیسی ہے؟ ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:-

علامہ رشید مدیر "المنار" مصر اپنی کتاب "السنۃ والشیعہ" صفحہ ۴ میں ابنِ سبا اور جنگِ جمل کے تذکرہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"جو شخص جنگِ جمل کے واقعات کو تاریخِ کامل ابنِ اثیری میں غور کی نگاہ سے دیکھے تو اُسے اندازہ ہوگا کہ سبائیوں کی سازش اور فتنہ انگیزی کہاں تک کامیاب ہوئی"۔

فاضل مصنف نے اس عبارت میں بالصراحت لکھا ہے کہ ان کا ماخذ تاریخ کامل ہے، چنانچہ انھوں نے قارئین کی سہولت کی خاطر صفحات کی بھی تعیین کر دی ہے۔ اسی طرح مورخ ابو الفداء (المتوفی ۷۳۲ھ) نے بھی اپنی تاریخ میں دیگر غلط سلط قصوں میں اس قصے کو بھی نقل کیا ہے اور کتاب کے دیباچہ میں باین الفاظ وضاحت کر دی ہے:۔

"فاخترتہ واختصرتہ من الکامل تالیف الشیخ عزالدین علی المعروف بابن الاثیر الجزری" (یعنی میں نے اپنی تالیف (تاریخ) کو ابن اثیر کی تاریخ کامل سے ہی انتخاب کر کے لکھا ہے)

اس کے بعد جب ہم ابن اثیر (المتوفی ۶۳۰ھ) کی تاریخ کی چھان بین کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ پورا افسانہ ۳۰ھ کے واقعات میں بیان کیا ہے، مگر یہ ذکر نہیں کیا کہ انھوں نے اسے کہاں سے اور کیسے لیا؟ البتہ اپنی کتاب کے مقدمہ میں صراحت کر دی ہے کہ:۔

"میری تاریخ کا ماخذ زیادہ تر تاریخ طبری ہی ہے اور خصوصاً وہ واقعات جو صحابۂ رسولؐ کے مناقشات اور اُن کے لڑائی جھگڑے کے متعلق ہیں وہ میں نے اسی قدر لکھے ہیں جس قدر طبری سے ملے ہیں اور

میں نے تمام مورخین میں سے طبری پر ہی اس لئے بھروسہ کیا ہے کہ وہ اس فن کے واقعی امام، جامع العلوم، صحیح الاعتقاد اور صداقت شعار تھے"۔

مورخ ابو الفداء ہوں یا علامہ رشید مصری، سب ہی نے ابن سبا کے قصہ کو ابن اثیر ہی کی تاریخ کامل سے نقل کیا ہے۔ اور ابن اثیر کی تاریخ خلاصہ ہے تاریخ طبری کا۔ اگرچہ صاحب تاریخ کامل نے دوسری تاریخوں سے بھی کم وبیش استفادہ کیا ہے تو چونکہ ابن سبا کی کہانی میں صحابہؓ کے مناقشات مذکور ہیں اس لئے بقول خود ابن اثیر یہ قصہ تاریخ طبری سے ہی اخذ کیا گیا ہے۔

یہی حال صاحب "البدایہ والنہایہ" علامہ ابن کثیر دمشقی (المتوفی ۷۷۴ھ) کا ہے، انھوں نے ابن سبا کا پورا قصہ نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:-

"ھٰذا ملخص ما ذکرہ ابوجعفر ابن جریر رحمہ اللہ"

(یہ خلاصہ ہے اس کا جسے ابن جریر طبری نے ذکر کیا ہے)

(البدایہ والنہایہ جلد ہفتم صفحہ ۲۴۶)

اب رہ گئے ڈاکٹر حسن ابراہیم اور احمد امین مصری۔ انھوں نے اپنی اپنی تصنیفات میں ابن سبا کے افسانہ کو جہاں بھی ذکر کیا ہے وہاں حواشی پہ تاریخ طبری کا ہی حوالہ درج کیا ہے۔ اطمینان کے لئے ملاحظہ ہو حاشیہ "فجر الاسلام" مؤلفہ احمد امین مصری صفحہ ۱۳۶:-

"انظر الطبری ج ۵ صفحہ ۲۶ وما بعدھا" (یعنی دیکھو طبری جلد ۵، صفحہ ۲۶ اور اس کے آگے۔)

اسی طرح ڈاکٹر حسن ابراہیم اپنی کتاب "تاریخ الاسلام السیاسی" صفحہ ۳۴۷ میں حضرت عثمان کے آخر زمانہ خلافت میں مسلمانوں کی حالت کی تصویر کشی اور ابن سبا کی

شرانگیزی کاروناردتے ہوئے حاشیہ پر تاریخ طبری کا ہی حوالہ پیش کرتے ہیں۔

پھر آگے چل کر صفحہ ۳۴۹ پر لکھتے ہیں :۔

" ابن سبا، جس نے سب سے پہلے حضرت عثمان سے لوگوں کو متنفر کیا، اُس نے انھیں خلافت سے معزول کرنے کے لئے راستہ بالکل ہموار پایا۔"

اس عبارت کے حاشیہ پر بھی ڈاکٹر صاحب موصوف نے چار مرتبہ طبری کا ہی حوالہ دیا ہے اور صفحہ ۳۵۲ تک اس قصّہ کو تحریر کرتے ہوئے بارہ مقامات پر طبری کو ہی پیش کیا ہے۔

اس کے علاوہ ایک مشہور مورّخ فرید وجدی نے بھی اپنی کتاب "دائرۃ المعارف" جلد ۷ میں لفظِ "عثم" کے تحت اور جنگِ جمل کے ذکر کے موقعہ پر بسلسلۂ حالاتِ علیؑ ابنِ ابی طالب علیہ السّلام ابنِ سبا کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ اور پھر صفحہ ۱۶۰ صفحہ ۱۶۸ اور صفحہ ۱۶۹ پر اشارۃً یہ بھی لکھا ہے کہ ہم نے اِس قصّہ کو طبری سے ہی نقل کیا ہے۔

رہ گئے مستشرقین، تو اُن میں فان فلوتن صاحبِ سیادتِ عربیہ ہوں یا تاریخ ادبِ عربی کے مصنّف نکلسن۔ یہ دونوں بھی طبری کے ہی دسترخوان پر بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ انھوں نے جابجا اپنے حواشی میں طبری کا ہی حوالہ دیا ہے۔

البتہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مستشرقین مصنّفین نے ابن سبا کے حالات لکھتے ہوئے طبری اور مقریزی دونوں کا حوالہ پیش کیا ہے۔ مقریزی کی روایات اِس لئے ناقابلِ اعتماد ہیں کہ نہ تو اُس نے سلسلۂ اسناد ذکر کیا اور نہ ہی وہ ماخذ بتایا جس سے اُس نے اس کہانی کو لیا۔

مقریزی نویں صدی کا مورّخ ہے۔ جو واقعہ اس کی پیدائش سے قریباً آٹھ صد سال پہلے گزرا ہو اُسے بغیر کسی سند و حوالۂ کتاب بیان کر دینا جتنا ناقابلِ اعتبار ہو سکتا ہے وہ

ظاہر ہے۔ اور یہ احتمال بھی ہو سکتا ہے کہ دوسرے مورخین کی طرح مقریزی کا ماخذ بھی طبری ہی ہو۔

اب رہ گئیں انسائکلوپیڈیا برٹانیکا اور جامع اللغات۔ تو صاحبِ جامع اللغات نے تو ابن سبا کے متعلق اسی انسائکلوپیڈیا کی انگریزی عبارت کو اردو کا لباس پہنا دیا ہے، اور خود انسائکلوپیڈیا بذاتہ کوئی معتبر ماخذ ہی نہیں۔ اس کے سامنے بھی وہی تاریخیں ہیں جن کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ اس لئے ابن سبا کے معاملہ میں جس طرح دوسری تاریخوں کا ماخذ طبری ہے، اُسی طرح یہ کتاب بھی اسی کی خوشہ چین نظر آتی ہے۔

مختصر یہ کہ ابن سبا کا قصّہ خوب پھیلا اور مشہور ہوا۔ اکثر مورخین نے اس قصّہ کو اسناد کے ساتھ ذکر کیا اور بلا واسطہ یا بالواسطہ طبری تک ہی اس کو پہنچایا۔ کچھ مورخین ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنی کتاب میں اس قصّہ کو بلا حوالہ ہی درج کیا ہے لیکن کتاب کے شروع یا آخر میں مصادرِ کتاب کی فہرست میں طبری کا نام لکھ دیا ہے، یا پھر اُن کتابوں کی تفصیل درج کی ہے جو طبری سے لکھی گئی ہیں۔

اِن تمام باتوں سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی ہے کہ طبری سے ہی اِس قصّۂ ابن سبا کی بنیاد پڑی اور بعد میں آنے والے مورخین نے اُن پر حیرت انگیز حد تک اعتماد کرتے ہوئے آنکھ بند کر کے اس افسانہ کو اپنی کتاب کی زینت بنا لیا اور سمجھ بیٹھے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

اس واسطے ضروری ہوا کہ ہم طبری کے اوراق پر توجہ مرکوز کریں اور ابن سبا کی کہانی کے رواۃ کے سلسلۂ اسناد کی چھان بین پر زور دیں۔

مؤرّخ طبری اور ابنِ سبا

ہم یہ تو ثابت کر چکے کہ مورخین نے ابنِ سبا کے من گھڑت افسانہ کو طبری سے ہی ماخوذ کیا ہے۔ طبری سے پہلے کی تاریخیں اس ذکر سے خاموش نظر آرہی ہیں۔ اب اگر طبری کے اس باب کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ مؤرّخ طبری نے فقط ایک شخص سیف بن عمر تمیمی برجمی کوفی کے واسطہ سے اس افسانہ کو روایت کیا ہے۔ چنانچہ ۳۰ھ کے واقعات میں امام طبری بیان کرتے ہیں:۔

"اسی سال (۳۰ھ) جناب ابوذرؓ اور معاویہ علیہ کے اختلافات و نزاعات ظہور پذیر ہوئے، اور معاویہ نے انھیں شام سے ہٹا دیا۔

بہت سی ایسی باتیں ہیں جن کو ذکر کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا جو لوگ اس بارے میں معاویہ کو بے قصور خیال کرتے ہیں اُن لوگوں نے اس کے متعلق ایک قصہ بیان کیا ہے۔

مجھے سیری نے لکھا کہ شعیب سے سیف نے حدیث بیان کی، اُس نے عطیہ سے سُنا، اُس نے یزید فقعسی سے، یزید فقعسی کہتا ہے جب ابن سودا (ابن سبا) شام میں وارد ہوا تو ابوذرؓ سے ملا، اور کہا کہ اے ابوذرؓ آپ معاویہ پر تعجب نہیں کرتے"

(تاریخ طبری، جلد ۳ ص ۳۳۵)

اس کے بعد طبری نے ابن سبا اور ابوذر کے قصہ کو سیف کے حوالہ سے بیان کرتے ہوئے آخر میں ابوذرؓ کے حالات اِس فقرہ پر ختم کئے ہیں کہ دوسرے لوگوں نے ان واقعات کے اسباب میں بے شمار اور بہت سے قابلِ شرم اُمور بیان کئے ہیں جنکے ذکر کو میں نے پسند نہیں کیا ہے۔ پھر ۳۱ھ سے لیکر ۳۶ھ تک کے واقعات میں بسلسلہ

قتل عثمان و جنگ جمل طبری نے ابن سبا کے اس افسانہ کو اسی سیف کے ہی حوالہ سے بیان کیا ہے۔ سیف کے علاوہ کوئی دوسرا واسطہ ہی نہیں۔ اس سلسلہ میں اگر تاریخ ابن عساکر کا مطالعہ کیا جائے تو وہاں بھی یہی سیف ہی نظر آتا ہے۔ اور ابن عساکر کی تاریخ کا خلاصہ نویس عبدالقادر بن احمد بن بدران بھی ابن سبا کے قصّوں کو سیدھا سیف تک منسوب کر کے طبری کا حوالہ پیش کر دیتا ہے۔

بہر حال ان قصّوں اور افسانوں کو ابن عساکر نے سیف سے خواہ طبری کے واسطہ کے بغیر بیان کیا ہو یا پھر طبری کے واسطہ سے، دونوں صورتوں میں ان کا سلسلۂ روایت سیف ہی پر جا کر تمام ہوتا ہے۔ اسی نے سب سے پہلے اسے تراشا اوّل اوّل اسکی طرف سے ہی اس کی نشر و اشاعت ہوئی۔

سیف ابن عمر
"علمائے رجال اور محدّثین کی نظر میں"

جب ہمیں یہ معلوم ہو چکا کہ سیف ابن عمر ہی وہ راوی ہے جس نے ابن سبا اور سبائین کے قصّہ کو افسانوی رنگ میں از خود بیان کیا، تو مناسب ہے کہ اُس کی شخصیت اُسکے صدق و کذب اور ضعف و ثقاہت پر علمائے رجال اور محدّثین عظام کے خیالات کا پتہ چلائیں کہ اُن کی اس کے متعلق کیا رائے ہے۔

یہ سیف ابن عمر تمیمی برجمی کوفہ کا رہنے والا تھا اور دو کتابوں "الفتوح والردّہ" اور "الجمل والسّیر" عائشہ و علیؑ کا مؤلف ہے۔ زمانۂ خلافتِ ہارون الرشید ۱۷۰ھ میں اسکا انتقال ہوا۔ رواۃ کی شخصیت کا اندازہ کچھ تو ان کے حالات سے ہوتا ہے جو فن رجال کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ اور کچھ ان کی بیان کردہ روایات و احادیث کو پرکھنے اور انکی

چھان بین کرنے سے۔ تو جب ہم کتبِ فنِ رجال کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ ائمۂ رجال نے سیف کا تذکرہ اِن الفاظ میں کیا ہے:۔

۱۔ "یروی عن خلق کثیر من المجھولین" (بے شمار گمنام اور مجہول الحال لوگوں سے روایت کرتا ہے)۔

۲۔ "ضعیف الحدیث لیس بشیءٍ" (اس کی حدیثیں بہت ضعیف ہیں وہ کچھ بھی نہیں)

۳۔ "متروک یضع الحدیث" (متروک ہے حدیثیں گھڑا کرتا تھا)

۴۔ "وھو فی الروایۃ ساقط" (یہ ساقط الروایت ہے)

۵۔ "یروی الموضوعات عن الثقات" (معتبر اور ثقہ لوگوں سے منسوب کرکے مَن گھڑت احادیث روایت کرتا ہے)

۶۔ "عامۃ حدیثہ منکرۃ متھم بالوضع والزندقہ" (اس کی زیادہ حدیثیں منکر ہیں اور وضع اور زندقہ کے ساتھ متہم ہیں)

(فہرستِ ابنِ ندیم ص۱۳۷۔ میزان الاعتدال جلد۱ ص۴۳۸)

(تہذیب التہذیب، جلد۴ ص۲۹۵ مطبوعہ حیدرآباد، دائرۃ المعارف ۱۳۲۵ھ)

علّامہ جلال الدّین سیوطی نے اپنی کتاب "لئالیِ مصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ" میں صرف ایک حدیث بطورِ نمونہ سیف ابنِ عمر سے نقل کی ہے۔ اور نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہ حدیث موضوعہ ہے۔ اس کے سلسلۂ اسناد میں سب ہی ضعیف راوی ہیں۔ اور سب سے زیادہ ضعیف اُن میں سیف ہے۔

غرضیکہ فنِ رجال کے جلیل القدر علماء ابنِ معین۔ ابی حاتم۔ ابوداؤد۔ نسائی۔ دارقطنی۔ ابن عدی۔ ابنِ حبان۔ عباس بن یحییٰ وغیرہم سیف کو انہی الفاظ کے ساتھ یاد کرتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ابنِ سبا نام کا کوئی شخص عالمِ وجود میں ہی نہیں آیا۔ یہ ساری مصیبت سیف ابنِ عمر راوی کی ہے جس نے ابنِ سبا تو ابنِ سبا، ایسے فرضی صحابی بھی گھڑ لئے ہیں اور اُن کے نام سے فرضی روایات بیان کر دیں جو کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے۔ تمام مورّخین خواہ عرب کے ہوں یا عجم کے، یا پھر مستشرقین متقدمین ہوں یا متاخرین، سب نے ابنِ سبا کے قصّہ کو اسی سیف سے ہی نقل کیا ہے۔ اور سیف کی کذب بیانی اور افسانہ تراشی کا ہم نے پردہ چاک کر دیا ہے۔

اب جبکہ سیف ابنِ عمر کی قلعی بھی کُھل چکی اور ابنِ سبا کے قصّہ کی فرضی داستان بھی نکھر کر سامنے آگئی تو ہمارے خیال میں مورّخین کے ابنِ سبا کے متعلق حیرت انگیز بیانات تارِ عنکبوت سے بھی زیادہ کمزور ہو گئے ہیں، مگر پھر بھی ان کے مفروضہ بیانات سے جو شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اُن کو ہم صحیح تاریخ اور مسلّم اسلامی لٹریچر کی روشنی میں فکر و نظر کے اعتبار سے دیکھنا ضروری خیال کرتے ہیں کہ مورّخین و مصنّفین کے یہ الزامات اور نتائج کہاں تک درست ہیں۔

مورّخین کے شُبہات اور الزامات

(۱)۔ عبداللہ بن سبا نے اسلام قبول کرنے کے بعد اس عقیدہ کا رواج دیا کہ حضرت علیؑ وصیِّ رسولؐ ہیں اور اُن کی اطاعت فرض ہے۔ نیز یہ کہ شیعیت کے اصول یہودیت سے ماخوذ ہیں۔ اور جنابِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے۔ گویا عقیدۂ رجعت ابنِ سبا کا ہی وضع کردہ ہے۔

(۲)۔ حضرت عثمان کی مخالفت اور اُن کے سنسنی خیز قتل کی تمام تر ذمہ داری

ابنِ سبا پر ہی عائد ہوتی ہے۔ صحابۂ کرام یا دوسرے اکابرینِ ملت کا اِس میں کوئی ہاتھ نہیں۔

(۳) - حضرت ابوذر غفاریؓ ایسا جلیل القدر صحابی بھی ابن سبا کی تعلیمات سے متأثر ہو گیا۔

(۴) - قتلِ عثمان کے بعد حضرت علیؑ کی بیعت کرنے والے سبائیین ہی تھے جنکے سرگروہ عمارؓ یاسر۔ مالکؓ اشتر۔ صعصعہؓ بن صوحان عامی۔ عمرو ابن الحمق حجر بن عدی و محمدؐ بن ابی حذیفہ اور محمدؓ بن ابوبکر وغیرہ تھے، حالانکہ صحابہ کرام کی جماعت اُن کی مخالف تھی۔

(۵) - بصرہ کی جنگ جو جنگِ جمل کے نام سے مشہور ہے وہ ابن سبا اور سبائیین ہی کی ریشہ دوانیوں کا نتیجہ تھی۔ فریقین تو آپس میں شیر و شکر تھے اور صُلح و صفائی کی پُوری پُوری اُمّید ہو چکی تھی۔

اب ہم ان پنجگانہ مستخرجہ نتائج اور تنقیحات کو سلسلہ وار ذیل میں اپنے مباحث کا عنوان قرار دیکر ان پر تاریخی تبصرہ اور محققانہ تجزیہ کرتے ہیں۔ تفصیل سے لکھنا تو طول کا باعث ہوگا، کیونکہ یہ سب امور تاریخِ اسلام کا ایک مکمّل باب ہیں۔ اور ہماری یہ مختصر تالیف اس قدر متحمّل نہیں ہو سکتی۔ البتہ ان واقعات کا پس منظر اور اجمالی خاکہ پیش کر دینا ضروری ہے۔ تاکہ مورّخین کے تعصّب اور ان کی ذہنی بے راہ روی کے بارے میں ہمارے قارئین کسی حد تک رائے قائم کر سکیں۔ اور اُنھیں یہ پتہ چل جائے کہ فتنہ و فساد کی اصل وجُوہات کیا ہیں۔ نیز ملتِ اسلامیہ کی ایک اہم مذہبی جماعت کے امتیازی عقائد کے بارے میں جو پروپیگنڈا کیا گیا ہے وہ کہاں تک درست ہے؟ کیا یہ عقائد عینِ اسلام ہیں؟ یا کہ مورخین کے خیالی ہیرو "عبداللہ بن سبا" کے وضع کردہ؟۔

شیعیّت کے اصول

مورخین نے عبداللہ بن سبا کے واقعات میں پہلا الزام یہ لگایا کہ شیعیّت کے اصول یہودیت سے ماخوذ ہیں۔ اور یہ کہ ولایت و وصایت علیؑ کا مسئلہ بھی ابن سبا نے ہی ظاہر کیا۔ اور رجعت کا عقیدہ بھی اسی نے وضع کیا۔ ان کا خیال ہے کہ شیعوں نے اِنہی اصولوں کو اپنا کر دوسرے مسلمانوں سے الگ تھلگ اپنا ایک مذہب بنالیا ہے۔

ابن سبا کے متعلق تو ہم ثابت کر چکے کہ وہ فرضی شخص ہے۔ اس لئے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ شیعیت کے بنیادی عقائد اور اصولِ مذہب اُس نے گھڑے ہوں۔ پھر بھی ذیل کے صفحات میں شیعیت کے بنیادی اعتقادات اور اُس کی مختصر تاریخ کو اجمال کے طور پر پیش کر کے اس حقیقت کو واشگاف کیا جاتا ہے کہ شیعیّت درحقیقت اسلام کا دوسرا نام ہے۔ اس سلسلہ میں ہم حجۃ الاسلام۔ یگانۂ روزگار اور بحرِ تحقیق کے ناموَر غواص علامہ شیخ محمّد حسین آل کاشف الغطاء مرحوم کی تالیفِ منیف " اصل اصول شیعہ" جو انھوں نے عالمِ اسلام کے سامنے شیعیّت کا تعارف کراتے ہوئے ایسی ہی قسم کے الزامات اور اتّہامات سے متأثر ہو کر لکھی ہے سے چند ایک اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ کیونکہ اہلِ علم کی نگاہ میں شیخ مرحوم اُن اساطینِ علم میں سے ہیں جن کے خیالات کو سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

" شیعی نقطۂ نظر سے مذہب دو حصّوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔

یعنی علم و عمل۔

کچھ مسائل کا تعلّق عقل سے ہے اور کچھ مسائل جسم سے متعلّق ہیں۔ وہ مسئلے جو عقل سے متعلّق ہیں اُنھیں اصولِ دین سے موسُوم کیا جاتا ہے۔ اور وہ پانچ ہیں۔ (۱) توحید (۲) عدل (۳) نبوّت (۴) امامت (۵) قیامت۔

جمہور مسلمین کے نزدیک توحید۔ نبوّت اور معاد فقط تین اصولِ دین ہیں۔ مگر عدل اور امامت شیعوں کے امتیازی معتقدات ہیں جن پر وہ قرآن و حدیث سے کافی استدلال رکھتے ہیں۔ صاحبانِ ذوق اُن کے کتبِ کلامیہ کو مطالعہ کرنے کے بعد اس دعوے کی تصدیق فرما سکتے ہیں۔ چونکہ توحید۔ نبوّت اور معاد میں شیعوں کے ساتھ جمہور مسلمان بھی متفق ہیں اس لئے اِن تین اصولوں پر لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں البتہ عدل و امامت پر کچھ نہ کچھ تحریر کرنا ہم ضروری خیال کرتے ہیں۔

مسئلۂ عدلِ خداوندی

توحید و نبوّت کے علاوہ اُصولِ دین میں سے ایک اصل عدل بھی ہے

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ خداوندِ عالم کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ اور نہ اُس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا ہے جسے عقلِ سلیم بُرا سمجھے۔ جمہور مسلمانوں کا فرقہ معتزلہ اِس بارے میں شیعوں کے ساتھ متفق ہے۔ عدلِ خداوندی۔ باری تعالیٰ کی صفتوں میں سے ایک صفت ہے۔ جس کا وجود جامعیّت کمال و جمالِ الٰہیہ کے لئے ضروری اور شانِ توحید کے واسطے لازم سمجھا جاتا ہے۔ اسی واسطے امامیہ فرقہ نے مسئلۂ عدل پر خصوصیت کے ساتھ توجّہ دی اور خداوندِ عالم کی اِس صفت کو اصولِ دین میں شامل کرلیا۔ کیونکہ خداوندِ عالم نہ کسی انسان کو کسی کام کے واسطے مجبور کرتا ہے اور نہ کسی کو اُس کے ترک کرنے کے لئے جبر سے کام لیتا ہے۔ بلکہ فرزندانِ آدم مختار ہیں۔ اسی بنا پر عقل اور اہلِ عقل نے افعالِ انسانی کی مدح و ذم کو جائز سمجھا ہے۔ اور سزا و جزا کو درست خیال کیا ہے۔

اگر ہم اِس قاعدے کو تسلیم نہ کریں تو ثواب و عقاب کا نظریہ

ہی باطل ہو جاتا ہے۔ اور بعثتِ انبیاء اور نزولِ کتبِ سماویہ بے سود اور وعدہ وعید لا حاصل۔ مختصر یہ کہ اِس مسئلہ میں مذہبِ امامیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ عادل ہے اور انسان آزاد و مختار ہے شیعہ حضرات کا یہ موقف قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے اور اس پر وہ کافی سے زیادہ استدلال رکھتے ہیں۔

مسئلۂ امامت

عقیدۂ امامت اصولِ خمسہ میں سے دین کی ایک اہم اصل ہے۔ اور یہی وہ اساسی اور بنیادی نظریہ ہے جو اِس مکتبِ خیال کو عام مکاتبِ فکر سے علیحدہ کرتا ہے۔ امامیہ حضرات اِس عقیدہ پر قرآن و حدیث سے قطعی الدّلالات نصوص پیش کرتے ہیں۔ جس شخص کو ان کے مصنّفاتِ کلامیہ کو دیکھنے کا اتّفاق ہوا ہے وہ ضرور اس بات کی تصدیق کریگا۔ اتّہام تراشی وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں یا تو مذہبی تعصّب نے اندھا کر دیا ہے یا پھر وہ شخص جو اُن کے مذہبی ذخائر سے بے خبر ہے۔

شیعی نقطۂ نظر کے اعتبار سے امامت نبوّت کی طرح منصبِ الٰہی ہے۔ جس طرح خداوندِ عالم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہی نبوّت و رسالت کے جلیل القدر عہدہ کے لئے منتخب کر لیتا ہے۔ اُسی طرح امامت کے سلسلہ میں بھی کسی کو کوئی اختیار نہیں۔ خود ربّ العزّت نبی کو حکم دیتا ہے کہ وہ شخصِ منتخب کی امامت کا اعلان کرے۔ پیغمبر حسبِ الحکم شریعت کی تکمیل کے لئے نص کے ذریعہ اُس چُنی ہوئی ہستی کو خلق کا پیشوا بنا دیتا ہے۔ نبی اور امام میں فرق صرف یہ ہے کہ نبی پر وحی نازل ہوتی ہے اور امام خصوصی توفیق کے ذریعہ رسول سے احکام حاصل

کرتا ہے۔ نیز انبیار کی طرح امام بھی معصوم عن الخطاء ہوا کرتا ہے: تاکہ امکان وقوع خطا باقی نہ رہے۔

فرمانِ خداوندی " اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ۔ قَالَ لَا یَنَالُ عَھْدِ الظّٰلِمِیْنَ " عصمتِ امام کی روشن دلیل ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ عہدۂ امامت منصبِ الٰہیہ ہے۔ اور منصبِ خداوندی ظالم کو نہیں مِل سکتا۔ لہٰذا اسی عقیدۂ عصمتِ امام کی وجہ سے امامیہ حضرات ائمۂ اثنا عشر کو مفترض الطاعۃ خیال کرتے ہیں۔ اور یہی خاص وجہ ہے کہ امام تمام علوم و صفات کے لحاظ سے سارے زمانہ پر فوقیت رکھتا ہے۔ کیونکہ مقصدِ امامت ہی یہ ہے کہ ابناءِ انسانیت کو منزل تک پہنچایا جائے، اور نفوسِ بشری کو علم و عمل صالح سے سنوارا جائے۔ اِس بناء پر امام کمالات کے اعتبار سے نبی سے کچھ کم اور بشر سے بلند ہوتا ہے۔

یہ تھا وہ عقیدۂ امامت جس پر شیعوں کے مخالفین آوازیں بلند کرتے ہیں کہ یہ عقیدہ یہودیت سے ماخوذ ہے۔ اور حضرت علی علیہ السّلام کی اطاعت فرض ہونے کا نظریہ عبداللہ بن سبا کا بنایا ہے۔

رجال کشی کی عبارت کا مطلب

اِس سلسلہ میں یہ حضرات اپنے خیال کی تائید میں رجال کشی کی یہ عبارت بھی پیش کیا کرتے ہیں:۔

" ذکر بعض اهل العلم ان عبد الله بن سبا كان يهوديًا فاسلم ووال عليًا وكان يقول هو على يهوديته في يوشع بن نون وصى موسى بالغلو فقال

فی اسلامہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ و
وآلہ وسلم فی علی علیہ السلام مثل ذلک وکان اوّل
من اشھر بالقول بفرض امامۃ علی واظھر البرائۃ
من اعدائہ وکاشف مخالفیہ واکفرھم فمن ھھنا
قال من خالف الشیعہ اصل التشیع والرفض
ماخوذ من الیھودیۃ۔" (رجال کشی ص۷۱)

(ترجمہ)۔ "بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ عبداللہ ابنِ سبا یہودی تھا۔
پھر مسلمان ہوا تو حضرت علی علیہ السّلام سے محبّت کرنے لگا۔
جب وہ یہودی مذہب پر تھا تو یوشع بن نون اور حضرت موسیٰ کے
بارے میں غلو سے کام لیتا تھا۔ اسی عقیدہ کی بنار پر جب وہ
مسلمان ہوا تو جناب رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم اور
حضرت علی علیہ السّلام کے بارے میں بھی غلو کرنے لگا۔ اور
یہی وہ پہلا شخص ہے جس نے حضرت علیؑ کی امامت کے عقیدہ
اور ان کے دشمنوں سے برأت کا نظریہ مشہور کیا۔ اسی واسطے
شیعوں کے مخالفین اصل شیعیّت کو یہودیت سے ماخوذ خیال
کرتے ہیں۔"

مذہبیات کی بحث میں فریقین کے جذبات اگر تعصّب و عناد
سے خالی ہوں تو یقیناً معنی خیز نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ مگر جہاں حریف
کو محض زِچ کرنا ہی مطلوب ہو تو جو کچھ بھی تعاقب کرنے والے قلم سے بے پرواہ
ہو کر لکھ دیں انہیں کون روک سکتا ہے۔

علامہ کشی مرحوم کی محولہ بالا عبارت سے جسکا آغاز "ذکر

بعض اهل العلم "کے عنوان سے کیا گیا ہے صاف پتہ چلتا ہے کہ فاضل مرحوم نے نہ تو اپنا نظریہ لکھا ہے اور نہ ہی دوسرے شیعہ علماء کا خیال پیش کیا ہے۔ بلکہ اُن کا مطلب یہ ہے کہ مخالفین کے بعض اہلِ علم جنھیں شیعیت کے اصولِ مذہب سے کما حقہ واقفیت نہیں وہ "عبداللہ بن سبا" کے بارے میں ایسے ایسے خیال رکھتے ہیں اور اسی لئے شیعوں کے مخالفین کے نزدیک اصلِ شیعیت یہودیت سے ماخوذ ہے۔

حالانکہ شیعیت کی تاریخ آغاز کا اگر ذوقِ سلیم سے مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی نیا مذہب نہیں۔ بلکہ جہاں سے اسلام شروع ہوتا ہے۔ باغبانِ شریعت یعنی سرکارِ ختمی مرتبتؐ نے اسلام کے ساتھ ساتھ ہی اپنے ہی ہاتھوں سے یہ پودا لگایا، آبیاری کی، اور خود حضورؐ ہی اسکی نگہداشت فرماتے رہے۔ یہ پودا بڑھ کر ہرا بھرا درخت ہوا اور رسولِ اسلام کی زندگی میں پھولنے بھی لگا۔ مگر پھیلنے نہ پایا تھا کہ چراغِ نبوّت گُل ہو گیا۔"
آگے چل کر علامہ شیخ مرحوم شیعیت کی تاریخ آغاز بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"اس دعوے میں شیعہ منفرد نہیں بلکہ جمہورِ اسلام کے رواۃ اور محدثین اور علماء اعلام بھی شریک نظر آتے ہیں۔ احمد بن حنبل سیوطی۔ ابنِ حجر۔ زمخشری۔ نسائی۔ ابنِ اثیر وغیرہ فحول علماء کرام نے ابن عباس اور حضرت علی علیہ السلام وغیرہ سے یہ روایت کی ہے کہ جناب پیغمبر اسلام حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کو فرمایا کرتے تھے" انت وشیعتك لهم الفائزون يوم القيامة " ان علماء کے علاوہ

اہلِ حدیث نے بھی اس حدیث کو مختلف طرق سے بیان کیا ہے۔ تاریخ وحدیث کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسی حدیث پر عمل کرتے ہوئے عہدِ نبویؐ میں صحابۂ کرام کا ایک گروہ جنابِ امیرؑ کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ اس جماعت کا ہر فرد حضرت امیر علیہ السلام کو اپنا رُوحانی پیشوا۔ تعلیمِ رسول کا حقیقی مبلّغ نیز احکام و اسرارِ نبوّت کا واقعی شارح اور مفسّر تسلیم کرتا ہے۔ اور شیعہ کے نام سے شہرت پاتا ہے۔ صحابہ کی ایک جماعت تو پہلے ہی سے نفسِ رسولؐ کے ساتھ تھی۔ مگر پیغمبرِ اسلام کی وفات کے بعد سیاسی مناقشات کے دَور میں اور بھی بہت سے صحابۂ کرام نے آپ کی معیّت اختیار کرلی۔ سلمانؓ۔ عمارؓ۔ ابوذرؓ۔ مقدادؓ۔ خزیمہؓ ذوالشہادتینؓ اور ابو ایوبؓ انصاری ایسے قریباً اسّی سر برآوردہ اور بعد میں خصال شیخ صدوق کی روایت کے مطابق بارہ ہزار صحابی بدری اور عقبی مہاجرین وانصار ایسے تھے جو حضرت ابوتراب کی حمایت میں شامل ہو گئے۔ اور ان میں اکثر نے جنگِ جمل وحربِ صفین میں اپنی اپنی جانیں نثار کیں۔" (ماخوذ از "اصل اصولِ شیعہ")

اور اسی سلسلہ میں شاہ عبدالعزیز دہلوی نے تحفۂ اثنا عشریہ صفحہ ۱۶ میں اُن صحابۂ کرام اور ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین جو دبستانِ شیعیت میں ہی تربیت پاتے رہے کا ذکر شیعانِ علی میں کیا ہے۔ اور نہایت فراخدلی سے یہ اعلان بھی کیا کہ ہم بھی اسی شیعہ فرقہ سے ہیں۔

غرضیکہ صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے دَور میں تو شیعیت میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور خصوصاً حادثۂ فاجعۂ کربلا نے تو اتنا گہرا اثر چھوڑا کہ آج عالمِ اسلام میں شیعیت ایک مسلّم مذہبی تنظیم سمجھی جاتی ہے۔

مسئلہ وصایتِ علی علیہ السّلام

اور ابنِ سبا

قدیم سے یہ سنّتِ خداوندی چلی آرہی ہے کہ خدا کی طرف سے بندوں پر حجّت پُوری کی جاتی ہے۔ وہ حجّت کبھی تو نبی کے ذریعہ پُوری ہوتی ہے یا بعض اوقات خداوندِ عالم اس حجّت کو جانشینِ نبی کے ذریعہ پورا کرتا ہے تاکہ بندے یہ نہ کہیں کہ ہمیں ڈرانے والا کوئی نہ آیا۔ یہ سنّتِ خداوندی ایسی ہے کہ جس کو اُس نے اپنے اختیار ہی میں رکھا ہے۔ خود نبی کا انتخاب ہو یا اس کے وصی کا، خداوندِ عالم نے اسکا اہتمام خود کیا۔ کبھی تو "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً" اور "یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ" وغیرہ نصوصِ ظاہرہ سے اعلان فرمایا۔ پھر انبیاء کی زبان سے اُن کی جانشینی کا مسئلہ حل کروایا۔ جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون کو اور جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے ابنِ عم علیؑ ابنِ ابی طالبؑ کو وصی اور خلیفہ نامزد فرمایا۔

غرضیکہ جس طرح بھی اہتمام کیا گیا۔ آدم سے لے کر خاتم تک وصایت کا سلسلہ جاری رہا۔ ذیل میں ہم معتمد تاریخ سے چند ایک عبارتیں پیش کرکے یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ حضرت آدمؑ سے لیکر جناب خاتم الانبیاءؐ تک جتنے بھی مشاہیر انبیاء اور رسول گزرے ہیں انھوں نے اپنے بعد اپنا جانشین اور وصی خود مقرر کیا۔ چنانچہ علامہ طبری حضرت آدمؑ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ان آدم علیہ السلام مرض قبل موتہ احد عشر یومًا واوصی الی ابنہ وکتب وصیتہ ثم رفع کتاب

وصیۃ الی شیث ۔ (ترجمہ) حضرت آدم علیہ السّلام موت سے پہلے گیارہ دن بیمار رہے ۔ اور اپنے فرزند شیث کو وصی مقرر کیا اور اس وصیت نامہ کو لکھ کر حضرت شیث کے حوالے کیا "۔ (طبری جلد اوّل ص ۷۶)

"اسی طرح جناب شیث نے اپنے بیٹے انوش کو اور انوش نے اپنے بیٹے قینان کو اور قینان نے مہلائیل کو اور مہلائیل نے اپنے بیٹے یارد کو اور اُس نے اپنے فرزند ادریس کو وصی مقرر کیا ۔ اور ادریس نے متلوشلخ اور متلوشلخ نے اپنے بیٹے لمک کو اپنا وصی و خلیفہ اور جانشین مقرر کیا جو حضرت نوح علیہ السّلام کے والد بزرگوار تھے "۔

(طبری ، جلد ا ص ۷۸ ۔ تاریخ کامل جلد ا ص ۲۰)

"جب حضرت نوح علیہ السلام کا وقتِ وفات قریب آیا تو انھوں نے اپنے بیٹے سام کو وصی قرار دیا "۔

(کامل جلد ا ص ۲۶ ۔ روضۃ الصفا جلد ا ص ۳۰)

"اس کے بعد یہی سلسلہ چلتا ہوا حضرت ابراہیمؑ تک پہنچا ۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے اسحاقؑ ، اور اسحاقؑ نے یعقوبؑ اور جناب یعقوبؑ نے اپنے بیٹے یوسف علیہ السّلام کو وصی اور خلیفہ مقرر فرمایا ۔ بعد ازاں جناب یوسف علیہ السّلام نے جس روز انتقال کیا انھوں نے اپنے بھائی یہودا کو وصی بنایا "۔ (طبری جلد اوّل ص ۱۴۲ ۔ روضۃ الصفا جلد ا ص ۶۲)

"حضرت ایوبؑ کی عمر ۹۳ سال کی ہوئی اور اپنی موت کے وقت انھوں نے اپنے بیٹے حومل کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اُن کے بعد اُن کا بیٹا عبدان وصیت کے مطابق خلیفہ ہوا "۔ (طبری جلد اوّل ص ۱۶۷)

"حضرت موسیٰؑ نے بھی اپنا جانشین خود مقرر کیا، اوّل حضرت ہارونؑ کو اور جب اُن کا انتقال ہوگیا تو پھر یوشع بن نون کو وصی بنایا۔"

(طبری جلد اوّل ص ۲۲۵)

"خداوندِ عالم کی اس سنّت پر عمل کرتے ہوئے حضرت یوشع بن نون نے کالب بن یوحنا اور انھوں نے اپنے فرزند یوساموسس کو خلیفہ بنایا۔" (کامل جلد ا ص ۷۔ روضۃ الصفا جلد ا ص ۱۳۵)

جنابِ الیاسؑ پیغمبر اور اُن کے بعد الیسع اور جناب شعیا وغیرہ کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السّلام کی نسبت علّامہ ابنِ اثیر لکھتے ہیں:۔

"وتوفی قبل ان یستتم بنائہ واوصیٰ الیٰ سلیمان"

(حضرت داؤدؑ نے اپنی عمارت مکمل کرنے سے قبل ہی انتقال کیا اور خلافت کی وصیت اپنے بیٹے سلیمانؑ کی طرف کی) (تاریخ الکامل جلد ا ص ۷)

"حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے وصایا میں سے ایک وصیت یہ بھی تھی کہ خداوندِ عالم نے انھیں شمعون کو وصی مقرر کرنے کا حکم دیا اور حواریوں نے شمعون کی خلافت کو قبول کیا۔" (روضۃ الصفا جلد ا ص ۱۸۴)

حضرت آدم علیہ السّلام سے لیکر حضرت ادریسؑ تک جن اوصیاء کا ذکر ہم نے کیا ہے اُن تمام کے متعلق حامد الانصاری تک نے بھی اپنی کتاب "اسلام کا نظام حکومت" مطبوعہ دہلی صفحہ ۱۰۷ میں نہایت تفصیل سے تذکرہ کیا ہے۔ علامہ مسعودی جنھیں مورخین میں غیر معمولی تفوّق حاصل ہے وہ اپنی تاریخ "مروج الذہب" میں انبیاء علیہم السّلام کے اوصیاء کے تقرر کا بیان تفصیل کے ساتھ پیش کرتے ہوئے آخر کلام میں لکھتے ہیں:۔

"فکانت الوصیۃ جاریۃ منتقلۃ من قرنٍ الیٰ

قرنٍ الی ان ادی اللہ النور الی عبد المطلب وولدہٗ عبد اللہ الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔"

(ترجمہ)۔ پس یہ وصیت ایک زمانہ سے دوسرے زمانہ تک منتقل ہوتی رہی۔ یہانتک کہ خداوندِ عالم نے اس نور کو صلبِ عبد المطلب میں اور حضرت عبداللہ والدِ حضرت محمّد مصطفٰے صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں ودیعت کیا۔"

۔(مروج الذہب جلد اوّل ص۳۹)

حضرت آدمؑ سے لیکر خاتم الانبیاءؐ تک انبیاء کے حالات پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک موقعہ پر بھی انتخابِ جانشین اور تقرر وصی کا کام بندوں کے سپرد نہیں ہوا۔ بلکہ خداوندِ عالم نے اپنے خاص اہتمام سے اس امر کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ان میں ایسے نبی اور رسول بھی تھے جنھیں حکومت حاصل نہ تھی اور ایسے انبیاء بھی تھے جنھیں اقتدار کی مسند حاصل تھی۔ یہ قاعدہ بلا استثناء کے جاری رہا۔ ہر نبی اور ہر رسول اپنا جانشین بحکمِ خداوندی مقرر کرتا چلا آیا۔ اوّل یہ تقرر خدا کی طرف سے ہوتا اس کے بعد نبی یا رسول اس کا اعلان کر دیتا۔ اور ہونا بھی ایسا چاہیئے تھا کیونکہ سنّتِ الٰہیہ میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ خود اس نے اپنے کلام میں ارشاد فرمایا ہے:۔

"لن تجد لسنّتہ اللہ تبدیلا" (خداوندِ عالم کی سنّت تبدیل نہیں ہوتی)۔

چنانچہ اسی سنّتِ قدیمہ کے مطابق خداوندِ عالم نے خاتم الانبیاؐء کے خلفاء اور جانشینوں کا مسئلہ حل فرمایا۔ اور وصایت کا سلسلہ جاری فرمایا "لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ" یعنی امّتِ محمّدیہؐ کے خلفاء کو بھی

اُسی طرح مقرر کروں گا جیسا کہ سابقہ انبیاء کے اوصیاء و خلفاء کے متعلق طریقہ اختیار کر چکا ہوں۔

لہٰذا خداوندِ عالم کے اسی اصولِ تقرر اور سُنّتِ انبیاء کے مطابق جناب سرورِ کائنات نے بھی وصایتِ علیؑ کا اعلان فرمایا۔ نبوّت کی ابتدائی دعوت کے دَور میں ہی دعوتِ ذوالعشیر کے موقعہ پر اپنے برادرِ ابنِ عم حضرت امیرالمؤمنین علیؑ ابنِ ابی طالبؑ کی وصایت کا اعلان کُھلے بندوں فرما دیا۔ مورخین اور محدّثینِ اسلام نے اس وصیّت کے الفاظ کو اِس طرح پیش کیا ہے:۔

"قال هذا اخي و وصي و خليفتي فيكم" (فرمایا، اے لوگو! یہ میرا بھائی میرا وصی اور تم میں میرا خلیفہ ہے)۔

(تاریخ ابوالفدا جلد ا صـ۱۱۶ ؛ طبری جلد ۲ صـ۲۱۷ ؛ کامل جلد ۲ صـ۲۲ ؛ البدایہ والنہایہ ؛ ابن کثیر جلد ۳ صـ۴۰ ؛ کنزالعمال جلد ۶ صـ۳۹۲ ؛ مسندِ احمد بن حنبل جلد ا صـ۳۳۱ ؛ مستدرک حاکم جلد ۳ صـ۱۳۳)۔

مفتیِ اعظم قسطنطنیہ شیخ سلیمان قندوزی حنفی نقشبندی حضرت امیرالمؤمنین علیہ السّلام کی وصایت کا تذکرہ اِن الفاظ میں کرتے ہیں:۔

"فرمایا جناب رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے کہ اے علی تم مجھ سے ایسے ہو جیسے آدمؑ سے شیثؑ اور نوحؑ سے سامؑ اور ابراہیمؑ سے اسحٰقؑ اور جیسے موسیٰؑ سے ہارونؑ اور عیسیٰؑ سے شمعونؑ ہیں۔ تم میرے وصی اور میرے وارث ہو۔ اور اُن تمام وصیوں میں سے تم دین و علم اور حلم و شجاعت اور سخاوت میں افضل و بہتر ہو"

(ینابیع المودۃ مطبوعہ استامبول صـ۸۶)

امام شافعیؒ جو ائمۂ اسلام میں غیر معمولی شہرت کے مالک ہیں وہ اپنے عقیدہ

کا اظہار یوں کرتے ہیں :-

عَلِیٌّ حُبُّہٗ جُنَّۃٌ ۔۔۔ قَسِیْمُ النَّارِ وَالْجَنَّۃِ
وَصِیُّ الْمُصْطَفٰی حَقًّا ۔۔۔ اِمَامُ الْاِنْسِ وَالْجِنَّۃِ

(”علی کی محبت گناہوں کے لئے ڈھال ہے ۔ علی جنّت و دوزخ کے تقسیم کرنے والے ہیں ۔ اور وہ محمد مصطفٰےؐ کے حقیقی وصی اور جن و انس کے امام ہیں“)

(ینابیع المودۃ ص۸۶)

وصایت کی ان نصوصِ صریحہ کے علاوہ قرآن وحدیث کی بیشمار نصوصِ متواترہ اس مدعا پر روشن دلیل ہیں جن میں سے آیتِ ولایت ۔ حدیثِ ولایت ۔ حدیثِ منزلت حدیثِ غدیر اور حدیثِ ثقلین وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔ مگر ہم بخوفِ طوالت ان کو یہاں نقل نہیں کرتے ۔ تفسیر حدیث اور سیر تواریخ کی جن کتابوں میں وصایت و خلافتِ علی کا تذکرہ ہے ان میں پیغمبرِ اسلام سے یہ الفاظ صاف طور پر مرقوم ہیں کہ ”یا علی تم میرے بعد میرے وصی، خلیفہ ۔ جانشین ، میرے ولی اور خاتم الاوصیاء ہو“۔

اپنے ناظرین کی سہولت کے لئے ہم چند ایک حوالہ جات پیش کر دیتے ہیں تاکہ اربابِ ذوق ان مصنفات کی طرف رجوع فرما سکیں :-

”فتح الباری پارہ ۱۸ ص ۱۰۹ ؛ کنز العمال جلد ۶ ص ۱۵۳ ؛ مروج الذہب جلد ۲ ص ۲۹۱ ؛ نصائح کافیہ ص ۲۱/۲۲ ؛ دیوان حضرت علی ص ۵ ؛ درمنثور جلد ۲ ص ۸۱ ؛ روضۃ الاحباب جلد ۳ ص ۱۶ ؛ لئالی مصنوعہ جلد ۱ ص ۲۵۰“

عقیدۂ رجعت اور ابنِ سبا

رہا مسئلہ رجعت ، جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ابن سبا کا وضع کردہ ہے ، کیونکہ یہ خیال اُسی کا تھا کہ رسولِ خدا دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے تو میرے خیال میں یہ اعتراض بھی اُن

لوگوں کا ہے جنھوں نے کلامِ الٰہی میں تدبّر سے کام نہیں لیا۔ کیا خداوندِ عالم اِس بات پر قادر نہیں کہ وہ ایک گروہ کو دوبارہ زندگی عطا کرے؟ یہ کونسا ناممکن امر ہے۔ کلامِ الٰہی میں کیا یہ قصّہ موجود نہیں؟

"اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَھُمْ مُوْتُوْا ثُمَّ اَحْیَاھُمْ" (کیا اُن لوگوں کے حالات پہ غور نہیں کیا جو موت کے ڈر سے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ لیکن خدا نے کہا مرجاؤ اور انھیں موت آگئی۔ اس کے بعد پھر اس نے انھیں زندگی بخش دی۔)

اور یہ آیتِ کریمہ کیا مسئلہ رجعت پر نص صریحہ نہیں:۔

"یَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ کُلِّ اُمَّۃٍ فَوْجًا" (اور جس دن ہم ہر اُمّت میں سے ایک گروہ کو اُٹھائیں گے۔)

اگر اس آیت سے مراد قیامت لی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ بروزِ محشر ہر ایک قوم سے ایک گروہ محشور کیا جائے گا۔ گویا ساری مخلوق محشور نہیں ہوگی۔ اِس لئے یہ آیت قیامت سے متعلّق نہیں، بلکہ زمانۂ رجعت سے متعلّق ہے۔ جس دن کہ مخصوص گروہوں کو زندہ کیا جائے گا۔

عقیدۂ رجعت میں غلط اندیشوں کی تعریض اور ان کا مبالغہ صرف اُن کی ذہنی کج رفتاری کا نتیجہ ہے۔ ورنہ عقیدۂ رجعت شیعوں کا کوئی ایسا بنیادی مسئلہ نہیں جسکے عدم قبول پر ایک مسلمان کو خارج از اسلام سمجھا جائے۔ بلکہ اس کا اقرار اسی طرح ضروری خیال کیا جاتا ہے جس طرح اسلامی حلقوں میں اخبار بالغیب، علاماتِ قیامت۔ آمدِ علیٰؑ اور خروجِ دجّال وغیرہ کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ ابنِ سبا کا کوئی وجود تھا، اور چند ایک عقیدے اس کے ایسے بھی تھے جو شیعوں سے

ملتے جلتے ہیں۔ جیسا کہ بعض مورخین نے بیان کیا ہے تو کیا کسی مسئلہ میں یہودیت سے اتفاق یہودیت کی دلیل ہے؟ مسلمان توحید کے قائل ہیں اور یہودی بھی ایک خدا کی پرستش کرتے ہیں، تو کیا اس اشتراکِ خیال سے اسلام کو یہودیت سے وابستہ کرنے کی جرأت کی جا سکتی ہے؟ خدا جانے، اِس عقیدہ پر طعن دینے والوں کو کیا لذت محسوس ہوتی ہے جو اِس قدر جذبات کا مظاہرہ کرتے ہیں؟

حضرت عثمان کی مخالفت اور اُس کے اسباب و علل

اسلامی سلطنت کے اندر جو داخلی طور پر اختلافات رُونما ہوئے اور پیغمبر اسلام نے جن اختلافات کو بطورِ خبر فتنوں کے ضمن میں ارشاد فرمایا۔ وہ حرف بحرف خلافتِ عثمانیہ میں پُورے ہوئے۔ تاریخِ اسلام نے اِس افسوسناک باب کو مشاجراتِ صحابہ کے عنوان سے تعبیر کیا ہے۔ تاریخ کے انقلاب اور اسلامی سیاست کی ایک اہم فروگذاشت نے ساری مملکت کو بنی اُمیہ کے سپرد کر دیا۔ حضرتِ عمر کی وسیع و عریض چھوڑی ہوئی سلطنت پر اُن کا تسلط کیسے ہوا؟ تاریخ کا ادنیٰ طالبِ علم بھی اس حقیقت سے خوب واقف ہے۔

علّامہ مقریزی جنھیں مورخین میں غیر معمولی شہرت حاصل ہے وہ تعجب کرتے ہیں کہ "خلافت بنو اُمیہ تک کیسے پہنچ گئی، اور ان کے دل میں خلافت کی طمع پیدا کیوں کر ہوئی۔ اور پھر خلافت کو حاصل کرنے کے بعد کاش بنو اُمیہ عدل و انصاف سے کام لیتے۔ مگر انھوں نے فیصلہ و احکام میں خود رائی سے کام لیا اور مالِ خراج کو اپنا ذاتی مال سمجھا۔"

(النزاع والتخاصم ص۲۸)

ذیل میں اُن اُمور کی مختصر فہرست معتبر اسلامی تاریخوں سے پیش کی جاتی ہے جو حضرت عثمان کی مخالفت کا سبب بنے:

"اموالِ خراج ہو۔ یا اموالِ غنیمت، حضرت عثمان اور دوسرے بنوامیّہ ان سب میں آزادانہ رائے رکھتے تھے۔ وہ ہر مال کو مال اللہ اور اپنے کو مسلمانوں کا مالک و مختار جانتے تھے۔ ان کا یہ مقولہ تھا 'لناخذن حاجتنا هذا الفئ وان رغمت انوف اقوام' یعنی (ہم اس مالِ غنیمت سے اپنی حاجت بھر لے کر رہیں گے۔ لوگوں کو بُرا معلوم ہوتا ہے تو ہوا کرے۔)"

(الوعد الحق صہ ۲۳۹ و عثمان صہ ۱۹۳ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری)

وہ زمینیں جو کسی خاص شخص کی ملکیت نہ تھیں اور بارش کا پانی اکٹھا ہو جانے کے سبب سرسبز رہتیں اور چراگاہ کا کام دیتی تھیں، اسلام نے ایسی اراضیات میں تمام مسلمانوں کے مساوی حقوق قرار دیئے تھے۔ مگر بنو اُمیّہ نے یہ حقوق صرف اپنے لیے خاص کر لئے۔ مسلمانوں نے اس زیادتی پر صدائے احتجاج بلند کی۔ جو باتیں آگے چل کر حضرت عثمان کے قتل کا سبب بنیں اُن میں ایک یہ بات بھی تھی۔

خود حضرت عائشہ نے بھی حضرت عثمان کے اس فعل کو ان امور سے شمار کیا جو مسلمانوں کی ناراضگی کا باعث ہوئے۔ چنانچہ اُمّ المؤمنینؓ ارشاد فرماتی ہیں:۔

"ہم اُن کی ان باتوں پر ناراض ہوئے اور چراگاہوں کے اپنے ذات سے مخصوص کر لینے اور لوگوں کو کوڑے ڈنڈے سے مارنے پر بھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اُن کے مخالف ہو گئے اور ایسا کر ڈالا جیسے کپڑا رگڑا جاتا ہے۔" [فائق زمخشری جلد دوم صہ ۱۱۷۔ و نہایہ ابن اثیر جلد صہ ۲۹۸]

"بازار محضرول جو پیغمبر اسلامؐ نے عام مسلمانوں کے لئے وقف کیا ہوا تھا، اُسے حضرت عثمان نے اپنے چچا زاد بھائی اور داماد حارث بن حکم کو بطورِ جاگیر دے دیا۔ اس کے علاوہ ابوموسیٰ اشعری گورنر کوفہ

جب بہت سا سونا اور چاندی لیکر آئے تو اُسے حضرت عثمانؓ نے اپنی لڑکیوں میں تقسیم کر دیا، نیز بیت المال سے اپنی اراضیات کی آبادی اور اپنے مکانات کی تعمیر پر تصرّفات کئے"

(سیرتِ حلبیہ جلد ۲ صـ٨٧ - معارف ابنِ قتیبہ صـ٨٤ - عقد الفرید جلد ۲ صـ٢٦١)

حکم بن عاص جو رسالت مآبؐ کا دشمنِ ازلی تھا اور جسے آپؐ نے مدینہ سے طائف میں جلاوطن کر دیا تھا، آنحضرتؐ کے بعد حضرت ابوبکر و عمر نے بھی سنّتِ رسولؐ پر عمل کرتے ہوئے اُس کو جلاوطن ہی رکھا، مگر حضرت عثمان نے اسے صرف مدینہ واپس بُلانے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اُسے ایک لاکھ درہم اور بنو قضاعہ سے وصول شدہ مالِ زکوٰۃ جو تین لاکھ درہم تھے بھی دیدی۔ حکم بن عاص کے علاوہ اُس کے بیٹے مروان کا معاملہ ایسا ہے کہ اُس وقت کے تمام مسلمان حضرت عثمان کی اِس کارروائی سے سخت نالاں تھے۔ اور حقیقتاً مروان ہی کی بے اعتدالیاں اور سینہ زوریاں اصحابِ رسول کی برافروختگی کا موجب ہوئیں۔

فلسفی مورّخ ڈاکٹر طہٰ حسین "الفتنۃ الکبریٰ" میں حضرت عثمان کے حکم اور اسکی اولاد کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کرنے کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت عثمان نے حکم اور اُس کی اولاد کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ ثبوت ہے کہ انھوں نے محض انھیں نوازنے کے لئے مدینہ بلایا تھا اور دیگر مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنی جمعیت میں اضافہ کرنے اور سلطنت کے انتظامی معاملات کے کاموں اور مال و دولت سنبھالنے کے لئے واپس بلایا۔ چنانچہ حضرت عثمان نے حکم کو بہت سی دولت عطا کی اور جب حکم مرا تو انھوں نے اُس کی قبر پر خیمہ نصب کیا۔ انھوں نے حکم کے بیٹے حارث کو شہرِ مدینہ کی منڈی کا نگران مقرر کیا۔ لیکن اُس نے

لوگوں پر بھی زیادتی کی اور خود اپنے پر بھی۔ اس کا طرزِ عمل امانت اور پاکبازی کی بجائے حرص و طمع اور حبِ مال و زر کا آئینہ دار تھا۔ حضرت عثمان نے اس بات پر بھی بس نہ کیا بلکہ حارث کو بہت سامال بھی دیا، جس کا ذکر آگے آئے گا۔ پھر حضرت عثمانؓ نے مروان بن حکم پر خصوصی نوازشات کیں، اُسے مال دیا اور مقرب بنا کر اپنا وزیر و مشیر مقرر کر لیا۔

یہ ساری باتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حضرت عثمان نے حکم اور اُس کے بیٹوں کو صرف رحم و کرم کی وجہ سے واپس نہیں بلایا۔ بلکہ اُنکے بُلانے سے مقصد یہ تھا کہ وہ حضرت عثمان کے دست و بازو بن جائیں۔ میرا خیال ہے کہ حضرت عثمان کی اکثر باتوں میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن حکم اور اُس کی اولاد کا معاملہ ایسا ہے کہ اس میں حضرت عثمان کی طرف سے مدافعت مشکل ہے۔" (الفتنۃ الکبریٰ جلد اوّل اردو ص۲۰۷-۲۰۶)

"اس بات کے علاوہ حضرت عثمان کو افریقہ کی جنگ سے جو مال ہاتھ آیا جس کی تعداد پانچ لاکھ اشرفیاں تھیں وہ سب کا سب اپنی بیٹی اُمّ ابان کے شوہر مروان جو آپ کا چچازاد بھائی بھی تھا کو دیدیا۔ ان کا یہ فعل ان باتوں سے ہے جن کی لوگوں نے آگے چل کر گرفت کی۔ اِس طرح سعید بن عاص کا معاملہ ہے جس کا باپ عاص پیغمبرؐ کو اذیت پہنچانے والوں سے تھا۔ یہی برتاؤ عبداللہ بن خالد کے ساتھ رہا جو حضرت عثمان کا داماد بھی تھا، انھیں بصرہ کے بیت المال سے چھ لاکھ درہم دلوائے گئے۔" (مراۃ الجنان یافعی جلد ا ص۸۵۔ سیرت ابن ہشام جلد ۲ ص۲۵ معارف ص۸۴۔ عقد الفرید جلد ۲ ص۲۶۔ تاریخ کامل جلد ۳ ص۳۸۔ انساب الاشراف جلد ۵ ص۲۸)

ہم نے بطور نمونہ چند ایک مشہور واقعات پیش کر کے حقیقت کا اظہار کر دیا ہے

ورنہ حضرتِ عثمان کی عنایاتِ خسروانہ کی یہاں تو ایک طویل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے کہ کس طرح حضرت عثمان نے عوام کے حقوق اپنے اقرباء کے لئے مخصوص فرمادیئے جن لوگوں پر سب سے زیادہ داد و دہش کی بارشیں ہوئیں، اُن میں ابو سفیان۔ ولید بن عقبہ، عبداللہ بن ابی سرح اور صحابہ کرامؓ میں سے حضرت طلحہ بن عبید اللہ اور زبیر ابن العوام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ گویا حضرت عثمان کے دورِ خلافت میں سرمایہ دارانہ نظام اور جاگیر دارانہ خیال نے جنم لے لیا تھا۔ چنانچہ اسی دور کے متعلق جناب امیر علیہ السلام نے اپنے مشہور خطبہ شقشقیہ میں حضرت عثمان اور اُن کی قوم بنو امیہ کے مالیاتی مسلک پر تبصرہ فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

"قام نافجاً حضنیہ بین نثیلہ ومعتلفہ وقام معہ بنو ابیہ یخضمون مال اللہ خضمۃ الابل نبتۃ الربیع"

(قوم کا تیسرا آدمی .... کھڑا ہوگیا ساتھ ہی ساتھ اسکے باپ دادا کی اولاد بنو امیہ بھی کھڑی ہوگئی اور خدا کا مال اس طرح کھانے لگی جیسے اونٹ فصلِ ربیع کی گھاس کھا جاتا ہے۔) (نہج البلاغہ جلد اوّل ص۲۴)

حقیقت الامر یہ ہے کہ اکابر صحابہؓ مہاجرین و انصار کو معزول کر کے حکم اور اسکی اولاد کو مسلمانوں کا حاکم بنا دینا اور انہیں ہر قسم کی مراعات دیکر مالا مال کر دینا یہ سب کی سب ایسی باتیں ہیں جن سے امتِ اسلامیہ کے ساتھ محض زیادتی ہی نہیں ہوئی بلکہ پیغمبر اسلام کی سنّت اور حضراتِ شیخین کی سیرت سے سراسر انحراف کیا گیا۔ جس کا نتیجہ مسلمانوں کی خلیفۂ وقت سے برافروختگی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اکابرین صحابہ اور حضرت عثمانؓ

عبداللہ بن مسعودؓ

تمام مورخین نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ جب عمّالِ حکومت کی بے اعتدالیاں حد سے تجاوز کر گئیں تو صحابۂ کرامؓ اُٹھ کھڑے ہوئے اور حکومت پر کڑی تنقید شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں حضرت ابوذر غفاریؓ کا واقعہ تو مشہور ہے کہ انھیں اسی جرم میں ربذہ میں جلاوطن کر دیا گیا۔ ان کے علاوہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو پیغمبرِ اسلام کے اجلّہ صحابہ میں سے تھے۔ قرآن و حدیث کے زبردست عالم تھے، جب انھوں نے بھی حضرت ابوذرؓ کی طرح عمّالِ حکومت پر شرعی نقطۂ نظر سے تنقید شروع کی تو حضرت عثمان ناراض ہوئے اور اُن کے درمیان ترش کلامی اس حد تک پہنچی کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو پٹوا دیا گیا، یہاں تک کہ اُن کی پسلی چور ہو گئی۔"

(تاریخ ابن کثیر جلد ۷ صفحہ ۱۶۳؛ الفتنۃ الکبریٰ جلد ۱ صفحہ ۱۵۹)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین عبداللہ بن مسعودؓ کے حالات میں لکھتے ہیں:-

"جب حضرت عثمان نے مرکز کی طرف سے قرآن مجید کے نسخے اطرافِ مملکت میں بھیجنے کی مہم شروع کی اور اُس کی کتابت زید بن ثابت کی نگرانی میں مسلمانوں کی ایک جماعت کے ذمّہ لگائی۔ اور قرآن کے دیگر نسخوں کو جلانے کے احکامات جاری کئے تو قرآن کے نسخوں کے جلانے پر لوگوں نے حضرت عثمان کی مخالفت کی اور اُن پر اعتراضات کئے۔ اس موقعہ پر عبداللہ بن مسعودؓ کی مخالفت مزید شدت اختیار کر گئی اور اُن کی تنقید حضرت عثمان کے حق میں اور زیادہ سخت ہو گئی۔ وہ ہر جمعرات کو لوگوں سے وعظ فرماتے اپنی تقریروں میں کہا کرتے تھے' صادق ترین قول کتابِ خدا ہے اور بہترین طرزِ عمل محمدؐ کا طرزِ عمل ہے۔ بدترین اُمور وہ ہیں

جنھیں اپنی طرف سے دین میں ایجاد کر لیا گیا ہو، یعنی بدعتیں اور دین میں نیا اضافہ بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کا ٹھکانہ جہنّم ہے۔" (الفتنۃ الکبریٰ اردو ص ۳۴۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود کی ان تقریروں پر حضرت عثمان سخت غصہ ہوئے اور انھیں سخت سزا دلوائی۔ حضرت علی علیہ السلام نے حضرت عثمان کو ملامت کی اور عبداللہ بن مسعود کو اٹھوا کر گھر پہنچوا دیا۔ اس کے بعد فاضل مؤرّخ تحریر فرماتے ہیں:

"حضرت عثمان نے اسی پر بس نہ کیا بلکہ انھوں نے حضرت ابن مسعود کا وظیفہ بھی بند کر دیا اور انھیں مدینہ شریف میں نظر بند کر دیا۔ حضرت ابن مسعود نے مجاہدین کے ساتھ مل کر شام جانا چاہا مگر حضرت عثمان نے اجازت دینے سے انکار کر دیا کیونکہ اُن سے مروان نے کہہ دیا کہ اس شخص نے کوفہ کو آپ سے برگشتہ کر دیا ہے۔ اب آپ اسے یہ موقعہ نہ دیں کہ وہ شام کو بھی آپ سے برگشتہ کر دے۔ بدیں صورت ابن مسعود حضرت عثمان کی مخالفت لئے کوفہ منتقل ہو گئے اور وہاں کوئی دو تین برس مقیم رہے اور اس مخالفت کو پھیلاتے رہے۔ اسی اثناء میں اُن کی موت واقع ہو گئی۔" (الفتنۃ الکبریٰ جلد اوّل ص ۲۲۸)

حضرت عمارؓ بن یاسرؓ

حضرت عمار بن یاسر صحابۂ کرام کی جماعت میں امتیازی مقام رکھتے تھے اور پیغمبرِ اسلام کے جاں نثاروں میں سے تھے اور یہ بھی حضرت عثمان کے سخت ترین مخالفین میں سے تھے۔ چنانچہ جب صحابۂ کرام نے حضرت عثمان اور اُن کے عمالِ حکومت کے خلاف ایک احتجاجی جلسہ کیا جس میں ایک قرار داد کے ذریعہ حضرت عمار یاسر کو نامزد کیا گیا کہ وہ جملہ شکایات دربارِ خلافت تک پہنچائیں۔ حضرت عمارؓ ایک نوشتہ لے کر حضرت عثمان کے پاس پہنچے۔ نوشتہ

میں صحابۂ کرام کے خیالات کی پوری ترجمانی تھی کہ اگر آپ نے ان زیادتیوں کا تدارک نہ کیا اور ملتِ اسلام کے حقوق کو نہ پہچانا تو ہم لامحالہ کسی کارروائی پر مجبور ہوں گے۔ حضرت عمّار نے دربارِ خلافت میں جب اُسے پڑھکر سُنایا تو حضرت عثمان ناراض ہو گئے اور کہا اے عمارؓ! تجھے کیسی جرأت ہوئی کہ تم ہی اس نوشتہ کو میرے پاس لائے؟۔ تو حضرت عمارؓ نے فرمایا کہ مجھے آپ کی خیر خواہی منظور ہے۔ حضرت عثمان غصّہ سے سُرخ ہو گئے اور فرمایا کہ اے سمیہ کے بیٹے! تم جھوٹے ہو۔ حضرت عمّارؓ نے کہا کہ بیشک میں سمیہ کا بیٹا ہوں اور یاسر کا بھی۔ بس پھر کیا تھا، عثمان نے حکم دیا کہ اسے خوب پیٹا جائے۔ چنانچہ اسی وقت تعمیل کی گئی۔ اس مار پیٹ کے نتیجہ میں عمارؓ کو عارضۂ فتق ہو گیا اور وہ بے ہوش ہو گئے، یہاں تک کہ اُن کی چند نمازیں بھی قضا ہو گئیں۔ عمار کی توہین اور مار پیٹ کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ عوام کے جذبات بھڑک اُٹھے۔ خلیفہ کے خلاف نفرت اور ناراضگی کی لہر دوڑ گئی۔ امُّ المؤمنین حضرت عائشہ بھی سخت برہم ہوئیں اور انھوں نے بصدر رنج وملال عثمان سے فرمایا کہ افسوس! تم لوگوں نے کسقدر جلدی اپنے پیغمبرؐ کے طریقہ کو ترک کر دیا ہے۔"

(کتاب انساب الاشراف بلاذری جلد ۵ صفحہ ۴۸ مطبوعہ قدس، الفتنۃ الکبری جلد ۱ صفحہ ۱۶۶)

حضرت ابوذرؓ غفّاری اور عثمان

حضرت ابوذر غفّاری پہلے پہل اسلام قبول کرنے والوں میں سے ہیں۔ اور اُن بزرگوں میں سے ہیں جنھیں رسولِ خدا بہت چاہتے تھے اور جن کی پیغمبرِ اسلام بہت ہی تعریف فرمایا کرتے۔ ان کے زہد۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کے اعتبار سے انھیں مثیلِ عیسیٰ کہا جاتا ہے۔ اور عالمِ اسلام میں مسیح الاسلام کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کی صداقت۔ صاف گوئی اور بے باکی کی نسبت جناب پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:۔

"ما اقلت الغبراء ولا اظلت الخضراء رجلاً اصدق لهجۃً من ابی ذر" (زمین نے اور گنبدِ نیلوفری کے سایہ تلے کوئی فرد بھی ابوذر سے زیادہ صاف گو اور بیباک نہیں ہوا)

حضرت ابوذر کے حالات میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری اُن کے سیاسی و مذہبی مُوقف کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

"ایک روز حضرت ابوذرؓ کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت عثمان مروان بن حکم کو بہت سا زرو مال اور اس کے بھائی حارث بن حکم کو تین لاکھ درہم دے رہے ہیں۔ اُنھیں یہ بخشش قابلِ اعتراض معلوم ہوئی اور ان کی نظر میں بخشش کی یہ مقدار بھی بہت زیادہ تھی۔ چنانچہ حضرت ابوذر سے نہ رہا گیا، اور انھوں نے کہا۔ دولت جمع کرنے والوں کو عذابِ دوزخ کی بشارت دیدو اور ساتھ ہی یہ آیتِ کریمہ تلاوت کی۔ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹/۳۴) (اور جو لوگ سونے چاندی کے ذخیرے جمع کر رکھتے ہیں اور اُنھیں راہِ خدا میں خرچ نہیں کرتے اُنھیں دردناک عذاب کی بشارت دیدیجے)

مروان نے حضرت ابوذر کے اس قول کا شکوہ حضرت عثمان سے کیا۔ چنانچہ حضرت عثمان نے اُن کے پاس اپنا ملازم بھیج کر اُنھیں ایسی باتوں سے منع کیا۔ اس پر حضرت ابوذرؓ نے کہا کہ کیا حضرت عثمان مجھے کتاب اللہ کی قرأت اور حکمِ خداوندی کی نافرمانی کرنے والوں کی نکتہ چینی سے منع کرتے ہیں۔ اگر حضرت عثمان ناراض ہو جائیں اور خدا راضی رہے تو یہ بات مجھے زیادہ عزیز ہے بہ نسبت اس کے کہ حضرت

عثمان راضی ہوں اور خدا ناراض ہو جائے۔ حضرت عثمان نے ان کے بارے میں تحمل سے کام لیا لیکن حضرت ابوذرؓ اپنی تنقید و تنقیص پر باصرار قائم رہے اقتصاد و قناعت کی بدستور دعوت دیتے رہے۔ اور مال و دولت کی ذخیرہ اندوزی کے خلاف متواتر لوگوں کو متنفر کرتے رہے۔"

اس کے آگے چل کر فاضل موصوف لکھتے ہیں :-

"حضرت عثمان نے ابوذر سے تنگ ہو کر انھیں شام میں بھیج دیا۔ لیکن وہاں بھی وہ زیادہ دیر ٹھہر نہ سکے۔ انھوں نے شام میں بھی وہی کچھ کہنا شروع کیا جو مدینہ شریف میں کہا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں حضرت معاویہ کے بہت سے اقدامات پر اعتراضات کئے۔ انھوں نے حضرت معاویہ کے اس قول کی تردید کی کہ بیت المال خدا کا مال ہے اور کہا کہ وہ مسلمانوں کا مال ہے۔ انھوں نے امیر معاویہ کے تعمیر خضراء پر بھی اعتراضات کئے اور کہا "اگر تم نے اسے مالِ مسلمین سے تعمیر کرایا ہے تو خیانت کی ہے اور اگر اپنے مال سے بنوایا ہے تو فضول خرچی کا ارتکاب کیا ہے۔"

حضرت ابوذرؓ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ "اغنیاء کو فقراء کے حقوق تلف کرنے سے ڈرتے رہنا چاہیئے۔" لوگ حضرت ابوذرؓ کے گرد جمع ہو جایا کرتے، اُن کے ارشادات گوشِ توجہ سے سُنتے اور ان کی دعوت قبول کرتے تھے۔ حتیٰ کہ امیر معاویہ کو حضرت ابوذرؓ کی اس دعوت سے اہلِ شام کے برگشتہ ہو جانے کا خطرہ دامن گیر ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے حضرت عثمان کی خدمت میں شکایت نامہ ارسال کیا۔ حضرت عثمان نے جواباً تحریر کیا کہ ابوذر کو سخت بے پالاں سواری کے ذریعہ مدینہ بھیج دیا جائے۔

حضرت معاویہ نے تعمیلاً بڑی درشتی و بے مروتی کے ساتھ انھیں مدینہ کی طرف روانہ کر دیا۔ مدینہ پہنچنے پر بھی انھوں نے تبلیغ جاری رکھی اور یہ کہتے رہے کہ اصحاب زر کو اُن آتشیں سلاخوں کی بشارت دیدو جن سے ان کی پیشانیاں پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی۔ ساتھ ہی وہ حضرت عثمان پر بھی طعن و اعتراضات کرنے لگ گئے۔ کیونکہ انھوں نے مسلمانوں کے مال میں آزادانہ تصرف شروع کر دیا تھا۔ نوعمر افراد کو عامل بنا رہے تھے اور طلقا (فتح مکہ کے معافی دیئے ہوئے مغلوبین) کے فرزندوں کو مناصب حکومت عطا کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان باتوں سے حضرت عثمان تنگ آ گئے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، راوی اُسکے بارے میں مختلف الرائے ہیں۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ حضرت عثمان نے حضرت ابوذر کو حکم دیا کہ وہ مدینہ سے نکل جائیں اور جہاں چاہیں جا کر مقیم ہو جائیں البتہ شام۔ کوفہ۔ بصرہ اور مکہ میں اقامت گزیں ہونے سے منع کر دیا چنانچہ حضرت ابوذرؓ ربذہ میں چلے گئے"۔

(طبقات ابن سعد جلد ۴ ص ۱۶۸؛ بلاذری جلد ۵ ص ۲؛ الفتنۃ الکبریٰ جلد اوّل اردو ص ۲۵۶)

یہ ہیں وہ ناگوار حالات و واقعات جو حضرت ابوذر کو پیش آئے اور وہ صرف قرآن و احکام الٰہی، سنّت رسولؐ کی نشر و اشاعت کے جرم میں نہایت مسکنت کی حالت میں حرم رسولؐ سے جلا وطن کر دیئے گئے۔ سیاست وقت نے اتنا بھی خیال نہ کیا کہ وہ ایک جلیل القدر صحابی رسولؐ کے ساتھ اس قدر ناروا سلوک کرنے کی شرعاً کہاں تک مجاز ہے۔

مسلکِ ابوذرؓ اور ابنِ سبا

عبداللہ بن سبا کے قصہ کے رواۃ اور اس کے متعلق مبالغہ آمیزی سے کام لینے والے مورخین و مصنفین نے جہاں اس کے متعلق اور بہت سی باتیں کیں وہاں یہ بھی الزام لگایا کہ حضرت ابوذر غفاری ایسا پاکباز صحابی رسول بھی اس نومسلم یہودی کے جھانسے میں آیا ہوا تھا۔ حضرت عثمان

اور امیر شام کے خلاف تنقیدیں کرنا اور قرآنی آیات سے دولت جمع کرنے والوں کے خلاف احتجاج کرنا یہ سب کچھ ابن سباہی نے ابوذر کو سکھایا تھا۔ جدید عصر کے بعض نام نہاد مورخ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ اشتراکیت کی سب سے پہلی بنیاد ابن سبا نے رکھی اور اسکے خیالات سے متاثر ہو کر حضرت ابوذر غفاریؓ نے مملکت اسلامی میں اس کا پرچار کیا۔ گویا اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے مابین یہ سب سے پہلی جھڑپ ہوئی۔

یہ الزامات کہاں تک درست ہیں؟ اور کس حد تک ان پر اعتماد کیا جا سکتا ہے انکا جواب مصر کے فاضل علامہ ڈاکٹر طہٰ حسین کی طرف سے پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"عبد اللہ بن سبا کے اس قصہ میں جو سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز ہے وہ یہ ہے کہ اس نے حضرت ابوذرؓ کو امیر معاویہ کے اس قول پر کہ "بیت المال خدا کا مال ہے" اعتراض و تنقید کرنے کی تلقین کی اور انھیں سمجھایا کہ صحیح بات یہ ہے کہ امیر معاویہ کو یہ مال مسلمانوں کا مال کہنا چاہیئے۔ اسی تلقین کی روایت کے باعث یہاں تک کہا جانے لگا کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا امراء و اغنیاء پر تنقید کرنے کا جو طریقہ تھا اور زر و سیم کے ذخیرہ کنندگان کو وہ جو عذاب الیم کی بشارت دیتے تھے کہ اُن کی پیشانیاں، پہلو اور پشتیں آگ سے داغی جائیں گی تو انھیں یہ سارا مسلک ابن سبا نے ہی پڑھایا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس سے بڑی زیادتی اور کج فہمی کی مثال ملنی دشوار ہے۔ حضرت ابوذرؓ ہرگز اس امر کے محتاج نہ تھے کہ ایک نووارد انھیں یہ پڑھائے کہ فقراء کے اغنیاء پر بہت سے حقوق ہیں اور انھیں یہ بھی سمجھائے کہ زر و سیم جمع کر کے راہ خدا میں خرچ نہ کرنے والوں کے لئے عذاب الیم کی بشارت ہے۔ نیز انھیں یہ بات بھی بتائے کہ غنیمت، زکوٰۃ

یا خراج کا مال جو مسلمان بیت المال میں داخل کرتے ہیں یا ذمی بطورِ جزیہ یا خراج بیت المال کی نذر کرتے ہیں وہ مالِ مسلمین ہے لہٰذا واجب ہے کہ وہ مال بولنے میں بھی مسلمین ہی سے منسوب کیا جائے اور عملاً بھی انہیں پر خرچ کیا جائے۔

الغرض ابوذرؓ اس سے بالاتر تھے کہ ابنِ سبا انھیں اسلام کے اوّلین حقائق و مبادیات کا درس دیتا۔ حالانکہ ابوذرؓ تمام انصار اور بہت سے مہاجرین سے قبل اسلام لائے تھے وہ حضورِ اکرمؐ کی صحبت میں تا دیر رہے تھے انھوں نے بطریقِ احسن قرآن مجید حفظ کیا تھا وہ سنّت پر پختگی سے کاربند رہے تھے انھوں نے احوال و حقوق سے متعلق مسلکِ نبویؐ اور سیرتِ ابوبکر و عمر کو بچشمِ خود دیکھا تھا وہ اصولِ حرام و حلال سے اس طرح آگاہ تھے جس طرح دوسرے اصحابِ رسول آگاہ تھے اور ان پر بطرزِ احسن عمل پیرا بھی تھے۔

بہرحال جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ابنِ سبا نے ابوذرؓ سے مل کر انھیں اپنے بعض خیالات کی تعلیم دی۔ وہ اپنے آپ پر بھی ظلم کرتے ہیں۔ اور حضرت ابوذرؓ پر بھی ساتھ ہی وہ ابنِ سبا کو ایسا بلند مقام بخش دیتے ہیں جس تک پہنچنے کا اسے خیال بھی نہ آیا ہوگا۔ حالانکہ یہ وہی ابوذرؓ ہیں جن کے متعلق راویوں کا بیان ہے کہ ایک روز شام سے مدینہ واپس آنے کے بعد وہ حضرت عثمان کے دربار میں کہہ رہے تھے۔ "زکوٰۃ دینے والے کو یہ نہیں چاہیئے کہ وہ اپنے ذمّہ واجب الاداء زکوٰۃ ادا کر کے بس کر دے۔ اس کا فرض ہے کہ سائلوں کو دے، بھوکوں کو کھانا کھلائے اور اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتا رہے" کعب الاحبار اس وقت موجود تھے۔ انھوں نے

کہا "جس نے اپنا فریضہ ادا کر دیا، اُس کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔" اس پر حضرت ابوذرؓ کو غصہ آگیا اور کعب الاحبار سے کہا "اے یہودی بچے! تمھیں اس معاملہ میں دخل اندازی کرنے کی کیا مجال ہے، کیا تم ہمیں ہمارا دین سکھاتے ہو؟" اور ساتھ ہی اُنھیں اپنی لکڑی کی نوک بھی چبھوئی۔

غرض ابوذرؓ وہ شخص ہیں جو کعب الاحبار تک کو دین سکھانے کی اجازت نہیں دیتے، حالانکہ کعب الاحبار ابن سبا سے بہت پہلے اسلام لائے تھے اور وہ مدینہ کے پڑوس میں رہتے تھے، جہاں سے صبح و شام اصحابِ رسولؐ کے پاس آتے رہتے تھے۔ مزید برآں یہ کہ وہ حضرت عمرؓ اور عثمانؓ کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے رہتے تھے۔ اندریں حالات یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ابوذرؓ عبداللہ بن سبا سے اسلام کے بنیادی اصول اور احکام قرآنی میں سے کسی حکم کا سبق لینا گوارا کر لیتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی کے لئے یہ کس قدر مقام تعجب ہے کہ وہ ایک صاحبِ رسول کعب کو تو دین پر بحث بھی نہ کرنے دے اور پھر وہی دین عبداللہ بن سبا سے سیکھے۔"

(الفتنۃ الکبریٰ اردو جلد اوّل صفحہ ۲۸۶ تا صفحہ ۲۸۹)

مصری فاضل کے حقیقت افروز بیان سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آگئی کہ حضرت ابوذر جو کچھ بیان فرماتے اور حکومت پر تنقیدیں کرتے تھے وہ خود ان کے اپنے عقیدہ اور ان کے علم و یقین کی بنا پر تھا۔ یہ ساری تعلیمات عین اسلام کے مطابق تھیں اور انھیں وہ قرآن و حدیث سے حاصل کئے ہوئے تھے۔ ہم ابوذرؓ اور ان کے مثل دوسرے مسلمانوں کو اس سے بالاتر سمجھتے ہیں کہ ان کے دین و سیاست اور ان کی عقل و فکر کے جذبات سے ایک نو مسلم یہودی کھیل بنائے جسے مورخین کے بیان کے مطابق اسلام لائے ہوئے ابھی زیادہ دن بھی نہ گزرے تھے مزید برآں یہ

کہ اس نے اسلام بھی برغبت یا بخوف قبول نہ کیا ہو بلکہ محض مکر و سازش اور فریب دہی کی خاطر روپ دھارا ہو۔

صدرِ مجلسِ شوریٰ کی ناراضگی

صدرِ مجلسِ شوریٰ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف عام مسلمانوں کے عقیدہ کی رُو سے عشرہ مبشرہ میں داخل ہیں۔ اور ان کا شمار بڑی عظمت والے صحابہ میں سے کیا جاتا ہے۔ یہی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے مجلسِ شوریٰ کی سرپرستی کرتے ہوئے حضرت عمر کی بتائی ہوئی سکیم کے مطابق حضرت عثمان کو خلیفہ بنایا تھا۔ حالانکہ ان کے مقابلہ میں حضرت علی علیہ السلام ہر حالت میں فضل اور مستحقِ خلافت موجود تھے۔ جس وقت حضرت عثمان کی خلافت کے معاملات اس نہج پر پہنچ گئے کہ جن پر قابو پانا ناممکن نظر آنے لگا۔ لوگ حضرت ابن عوف کے پاس جاتے اور کہتے کہ یہ ساری مصیبت آپ کی ہی لائی ہوئی ہے، آپ خلیفہ عثمان کو تنبیہ کریں کیونکہ آپ پر یہ ذمہ داری سب سے زیادہ عائد ہوتی ہے کہ انھیں سمجھائیں کہ وہ راعی اور رعایا کے حقوق پہچانیں۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف حضرت عثمان کے پاس آئے اور عوام کی شکایات اُن کے سامنے پیش کیں۔ صاحبِ سیرتِ حلبیہ نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان نے عبدالرحمٰن کے چہرے کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ تم منافق ہو۔

(سیرتِ حلبیہ جلد ۲ صفحہ ۸۲)

چنانچہ اس کے بعد ابن عوف نے حضرت عثمان سے ترکِ موالات کیا اور کبھی بھی اُن سے کوئی تعلق نہ رکھا۔

صحابہ کرام اور جلاوطنی کی سزا

حضرت عبداللہ بن مسعود۔ عمار یاسر۔ ابوذر غفاری اور عبدالرحمٰن ابن عوف کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا اس کے متعلق تو ہم نے گذشتہ صفحات میں مختصراً ذکر کر دیا ہے کہ حضرت عثمان اور ان کے عمالِ حکومت کے اس اقدام سے پبلک میں ایک ناقابو اشتعال پیدا

ہو چکا تھا۔ ان کے علاوہ حکومت کی طرف سے اپنے مخالفین کے لئے ایک اور سزا تجویز کی گئی، یعنی یہ کہ جو بھی سر اٹھاتا اُسے فوراً جلاوطن کر دیا جاتا۔ صاحبِ سیرتِ حلبیہ نے عبادہ بن صامت کے متعلق لکھا ہے کہ :۔

"وہ شام میں رہتے تھے اور وہاں پر ہی سلطنتِ عثمانیہ کی کارروائیوں پر زبردست تنقید کرتے۔ شام کے گورنر معاویہ بن ابوسفیان نے حضرت عثمان کو ان کے حالات لکھے جس کے جواب میں مرکزِ خلافت کی طرف سے یہ حکم صادر ہوا کہ انھیں شام کے علاقہ سے نکال باہر کسی اور علاقہ میں بھیج دیا جائے۔" (سیرت حلبیہ جلد ۲ صہ ۸۷)

یہی حال عامر بن قیس کا ہوا، جس وقت کہ بصرہ کے مسلمانوں نے جمع ہو کر حضرت عثمان کے اعمال و کردار پر تنقید کی اور قرارداد پاس کی کہ عامر بن قیس جو اپنے وقت کے مشہور عابد، زاہد تھے کو بطورِ نمائندہ حضرت عثمان کے پاس بھیجا جائے تاکہ وہ اہالیانِ بصرہ کی شکایات کو اُن کے سامنے پیش کریں اور دادرسی کا مطالبہ کریں۔ عامر بن قیس مدینہ پہنچے اور اپنی نمائندگی کے فرائض سرانجام دیئے، مگر حضرت عثمان نے وہی سلوک کیا جو وہ دوسروں کے ساتھ کر چکے تھے۔ اور انھیں بصرہ سے شام کی طرف جلاوطن کر دیا۔

(عقد الفرید جلد ۲ صہ ۲۶۱)

مومنینِ کوفہ کا معاملہ

دیگر مسلمانوں کی طرح کوفہ کے عوام اور سربرآوردہ اشخاص بھی حکومتِ وقت کی سیاسی پالیسی سے نالاں تو تھے ہی مزید برآں ولید بن عقبہ کا نشہ کی حالت میں نماز پڑھا دینا موجب نفرت ہوا۔ چنانچہ حضرت عثمان کی خدمت میں شکایت بھیجی گئی جس پر انھوں نے ولید کو معزول کر کے اُن کی جگہ سعید بن عاص کو گورنر مقرر کر کے بھیج دیا۔ مگر سعید بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک نہ کر سکا۔ جب راعی اور رعایا کے درمیان مزید کشمکش ہوئی تو سعید نے معززینِ کوفہ کو جلاوطن کر نیکا

حکم حضرت عثمان سے حاصل کر لیا۔ چنانچہ صعصہ بن صوحان۔ زید بن صوحان۔ جندب بن زہیر۔ عدی بن حاتم۔ مالک بن حبیب۔ یزید بن قیس ارحبی۔ عمرو ابن الحمق۔ عروہ بن جعد اور حارث بن عبداللہ وغیرہ عمائدِ کوفہ کو جو جلیل القدر مومنین اور صحبت پیغمبر سے فیض یافتہ صحابی بھی تھے اور جن کی صحابیت پر کتبِ رجال گواہ ہیں۔ نیز یہ لوگ حضرت امیر المومنین علی ابنِ ابی طالب کے دست و بازو بھی تھے شام کی طرف جلا وطن کر دیا۔"

(تاریخ طبری جلد ۵ صـ۸۸۔ ابن خلدون جلد ۲ صـ۳۸۷)

اس جلا وطنی کو حضرت عثمان کے تمام ہم عصر صحابہ و تابعین نے ناپسند کیا مصر کے نامور مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین اس جلا وطنی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"حضرت عثمان کے ہم عصر صحابہ و تابعین نے اس جلا وطنی کو بہر حال ناپسند کیا اور اسے ناجائز جلا وطنی قرار دیا۔ کہنے والے کچھ ہی کہیں بہر صورت امام کو سزا دینے کا حق ہے لیکن اسے سزا دینے میں مروجہ اور معروف حدود سے تجاوز کرنے کا کوئی حق نہیں، ہم آگے دیکھیں گے کہ حضرت عثمان کے عمّال نے جلا وطنی کی سزا دیکر خود اپنے اوپر اور اپنے امام پر نیز لوگوں پر ظلم کیا۔" (حالاتِ عثمان جلد اوّل صـ۲۴۱)

محاصرہ اب جبکہ حالات اس منزل تک پہنچ گئے کہ بڑے سے بڑے گرامی قدر انسانوں کے سمجھانے پر بھی اربابِ اقتدار سے ٹس سے مس نہ ہوئے تو مدینہ میں مقیم مہاجرین و انصار کھلے بندوں حضرت عثمان کی مخالفت اور ان کے عبرت ناک قتل کی لوگوں کو ترغیب دینے لگے۔ ان کے علاوہ امہات المومنین کے وظائف بھی کم کر دیئے گئے۔ حالانکہ سابقہ دو خلافتوں میں امہات المومنین کا خاص طور پر احترام اور لحاظ کیا جاتا تھا۔ حکومت کا یہ فعل صحابہ کی اکثریت کی نفرت کا باعث ہوا۔ خود حضرت عائشہ اس قدر برافروختہ ہوئیں کہ ان کی ناراضگی مخالفین عثمان کیلئے

کے لیئے بہترین سہارا ثابت ہوئی۔ ان ہی حالات میں محمّد بن ابی بکر کے قتل کی سازش جلتی پر تیل کا کام کر گئی۔ اہل مصر نے ہر چند حضرت عثمان کو سمجھایا کہ اس سازش کے مرتکب مروان بن حکم جن کے پاس قلمدانِ وزارت تھا کو ہمارے حوالے کر دیا جائے مگر خلیفۂ وقت اپنی مشہور نرم دلی کی وجہ سے مروان کو ان کے حوالے نہ کر سکے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصری وفد نے انتقامی جذبات کے ساتھ غیظ و غضب کی حالت میں مدینہ کا محاصرہ کر لیا۔

امّ المومنین اور معتدر صحابہ کا فتویٰ

جب حضرت عثمان محصور تھے تو اسی دوران میں جناب ام المومنین حضرت عائشہ نے حج کی تیاری کر لی۔ مروان۔ زید بن ثابت اور عبدالرحمٰن بن عتاب ان کی خدمت میں آئے۔ اور عرض کی کہ اے اُمّ المؤمنین کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ سفر کا ارادہ ملتوی کر دیتیں۔ آپ دیکھ رہی ہیں کہ خلیفۂ وقت محصور ہیں، آپ کی موجودگی ان کے بچاؤ کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ عائشہ نے فرمایا کہ اب تو ہم نے تیاری مکمل کر لی ہے، ٹھہرنا ممکن نہیں ہے۔ ان لوگوں نے دوبارہ درخواست کی، مگر پھر بھی انکار کر دیا۔ اس کے بعد مروان یہ شعر پڑھتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔

حرق قیس علی البلاد حتی اذا اسعرت احذ ما

یعنی (قیس نے شہروں میں آگ لگا دی جب وہ آگ بھڑک اٹھی تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔)

بی بی عائشہ نے فرمایا "اے مروان سُن! خدا کی قسم، میرا تو جی چاہتا ہے کہ تمہارے اور تمہارے صاحب عثمان دونوں کے پیروں میں ایک چکّی بندھی ہوتی اور تم دونوں سمندر میں ڈال دیئے جاتے"۔ یہ کہکر آپ مکّہ روانہ ہو گئیں۔

(طبقات ابن سعد جلد ۵ ص ۲۵)

حدیث، لغت اور سیر و تواریخ کی معتبر کتابوں میں امّ المؤمنین کا ایک فتویٰ قتل حضرت عثمان کی نسبت پایا جاتا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں "اقتلوا النعثل" یعنی اے لوگو! نعثل کو قتل کردو۔ نعثل سے مراد وہ حضرت عثمان لیا کرتی تھیں۔

(اسد الغابہ جلد ۳ ص ۱۵ ۔ عقد الفرید جلد ۲ ص ۲۶۷ ۔ حیٰوۃ الحیوان جلد ۲ ص ۳۵)

اس فتویٰ کے لفظ نعثل کی تشریح کتبِ لغت مثلاً قاموس۔ تاج العروس نہایہ ابنِ اثیر اور لسان العرب وغیرہ میں موجود ہے۔

بلاذری نے روایت کی ہے کہ "جس وقت عبداللہ بن عباس کو حضرت عثمان نے موسمِ حج میں افسر مقرر کرکے مکّہ میں بھیجا تو راستہ میں امّ المؤمنین سے ملاقات ہوئی تو بی بی نے فرمایا "اے ابن عباس! خدا نے تجھے سمجھ بوجھ دی ہے لہٰذا لوگوں کو عثمان سے روگرداں کردو" پھر خود مکہ پہنچ کر مسجد الحرام میں بھی امّ المؤمنین نے حضرت عثمان کے خلاف بہت کچھ فرمایا"

(انساب الاشراف بلاذری جلد ۵ ص ۸۵/۱۹۱)

حضرت طلحہ اور زبیر حضرت طلحہ اور زبیر مقتدر صحابہ میں سے تھے۔ اور بقول ایک مسلک کے عشرہ مبشرہ کے درخشندہ ستارے اور حضرت عمر کی مقرر کردہ خلافت کمیٹی کے نامزد ارکان بھی تھے۔ پہلے پہل تو ان کے دلوں میں خلافت کا خیال تک بھی نہ تھا۔ مگر جب انھیں حضرت عمر نے امیدوارانِ خلافت میں انتخاب فرمالیا تو اس وقت سے ہی وہ اپنی کامیابی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ حضرت عثمان کے دور کے فتنوں میں اُن کی امیدیں اور زیادہ پختہ ہوگئیں۔ ابتدا میں تو یہ خاموش رہے۔ مگر بعد میں میدانِ خلافت کو صاف کرنے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور حضرت عثمان کے خلاف علانیہ لوگوں کو قتلِ خلیفہ پر اُکسانے کی کوششیں کرنے لگے۔

بلاذری نے ابنِ سیرین سے روایت کی ہے کہ:۔

"اصحابِ پیغمبر میں طلحہ سے بڑھکر خونِ عثمان کا کوئی پیاسا نہ تھا"

(انساب الاشراف جلد ۵ ص ۸۱)

"چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جنگِ جمل میں جب مروان نے ایک تیر کے ذریعہ حضرت طلحہ کو قتل کر دیا تو فخریہ کہا کہ آج میں نے عثمان کا بدلہ لے لیا ہے۔ جب حضرت عثمان محصور تھے تو حضرت علی المرتضیٰ نے طلحہ سے کہا کہ تم عثمان کو لوگوں سے بچانے کی کوشش کرو، تو جواب میں حضرت طلحہ کہنے لگے کہ خدا کی قسم اُس وقت تک ایسا نہیں کر سکتا جب تک کہ بنو امیہ پورا پورا قرضہ نہ ادا کر دیں۔ چنانچہ ایامِ محاصرہ میں جب کوفہ و بصرہ والے رات دن حضرت عثمان کے دروازے پر پہرہ دیتے تو طلحہ دونوں جماعتوں کو عثمان کے خلاف بھڑکاتے رہتے اور یہ کہتے کہ جب تک عثمان کو دانہ پانی مل رہا ہے انھیں تمہارے محاصرہ کی کیا پرواہ ہوگی۔ لہٰذا پانی اندر نہ جانے دیا جائے۔"

(امامۃ والسیاسۃ جلد ۱ ص ۲۴ ؛ طبری جلد ۵ ص ۱۳۹)

"یہی حال زبیر ابن العوام کا تھا وہ بھی حضرت عثمان کے خلاف عوام النّاس کو اُبھارتے تھے۔ زبیر اکثر فرمایا کرتے تھے "اقتلوہ فقد بدل دینکم" (اس کو قتل کر ڈالو اس نے تمہارے دین کو بدل دیا ہے) بعض لوگوں نے کہا کہ آپ کے بیٹے تو عثمان کے دروازے پر ان کی حمایت میں کھڑے ہیں۔ تو زبیر نے کہا کہ عثمان کا قتل کیا جانا مجھے ذرا بھی ناگوار نہیں، اگرچہ اس سے قبل میرا لڑکا ہی کیوں نہ قتل کر ڈالا جائے۔"

(شرح نہج البلاغہ ابنِ ابی الحدید جلد ۲ ص ۲۴)

صحابۂ کرام کا متفقہ فیصلہ

مدینہ کے عامۃ المسلمین اور صحابۂ کرام میں جب حضرت عثمان کے خلاف سخت ہیجان پیدا ہوا اور ان کے سمجھانے بجھانے پر بھی کوئی صورت کارگر نہ ہوئی تو ان لوگوں نے جن میں مہاجرین و انصار کی کافی جماعت موجود تھی، اپنے فیصلے کو آخری صورت میں اس طرح ظاہر کیا کہ مدینہ کے باہر جو صحابہ و تابعین سرحدی علاقوں میں مقیم تھے اور جہاد وغیرہ کی ضرورتوں کے ماتحت وہاں رہتے تھے انھیں خطوط لکھ کر منگوانا شروع کیا اور بغاوت میں دعوتِ شرکت دی۔

اور کہا کہ اگر آپ لوگ جہاد کرنا چاہتے ہیں تو جلدی مدینہ پہنچئے۔ کیونکہ دین محمدؐ میں فساد آگیا ہے۔" (طبری جلد ۵ ص ۱۹۶)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا بیان ہے کہ:۔

"مدینہ میں مقیم صحابہ ان اصحاب رسول کو لکھ رہے تھے جو سرحدی علاقوں میں منتشر تھے کہ مدینہ میں واپس آجایئے تاکہ خلافت کے معاملہ میں جو بل پڑ گئے ہیں انھیں نکالا جائے۔ یہ لوگ ان کو یہ بھی لکھتے تھے کہ آپ لوگ جہاد کی جستجو میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ میدانِ جہاد آپ کے پیچھے ہے۔ دین کی سلامتی اور حفاظت کی خاطر مدینہ کی طرف لوٹ آؤ کیونکہ اقتدار نے دین کو ایک بہت بڑے فساد کی نذر کر دیا ہے۔"

(الفتنۃ الکبریٰ اردو جلد اول ص ۲۴۳)

ایامِ محاصرہ میں جب حضرت عثمان نے امیر شام معاویہ بن ابو سفیان کو امداد کے لیئے طلب کیا تو وہ محض اس لیئے نہ آئے کہ مہاجرین و انصار چونکہ حضرت عثمان کے خلاف جمع ہو گئے تھے اور ان کی مخالفت کو امیر معاویہ نے ناپسند کیا۔ مورخ طبری نے عثمان کے خط اور معاویہ کے جواب کو ان الفاظ میں لکھا ہے:۔

"تحقیق اہلِ مدینہ پھر گئے ہیں۔ اور انھوں نے میری اطاعت چھوڑ دی ہے اور بیعت توڑ دی۔ تم بغیر توقف کے اہلِ شام کا ایک لشکرِ جرّار لے کر آؤ۔ جب معاویہ کو یہ خط ملا تو اُس نے تعمیلِ حکم سے لاپرواہی کی اور اصحابِ رسولؐ کی مخالفت کو مکروہ جانا، کیونکہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ عثمان کے خلاف جمع ہو گئے ہیں۔" (طبری جلد ۵ ص ۱۱۵)

حضرت عثمان کے زمانہ میں جو ملک کی حالت ہو گئی تھی وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اس زمانہ کے فتنہ و فساد کا ذکر تاریخ کی ہر کتاب میں پایا جاتا ہے اور فتنہ و فساد کی تصویر

حدیث کی ہر کتاب میں ملتی ہے۔ آنحضرتؐ نے جو اس زمانہ کی تصویر کھینچی ہے وہ کتاب الفتن کے عنوان سے کتب احادیث میں صراحت کے ساتھ موجود ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ فوراً ہی میرے بعد تم پر ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ لوگ اسلام کے دائرہ میں سے اس طرح خارج ہو جائیں گے جس طرح وہ فوج در فوج اس میں داخل ہوئے تھے۔ اور لوگ اس طرح دین سے نکل جائیں گے جس طرح تیر کمان سے نکل جاتا ہے اور پھر واپس نہیں آتا۔ صبح کو ایک شخص مؤمن ہے تو شام کو کافر، اور شام کو مؤمن ہے تو صبح کو کافر جمہور اسلام کا خیال ہے کہ یہ حالت حضرت عثمان کے زمانۂ شہادت کا نقشہ ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ حضرت عثمان کو خود مسلمانوں نے جن میں پیغمبر اسلام کے بہت سے جلیل القدر صحابۂ کرام بھی شامل تھے ملکر قتل کیا ہے۔ حضرت عثمان مظلوم قتل ہوئے یا قتل کرنے والوں کے پاس کوئی شرعی حجّت تھی۔ اس کا ذکر ہم نے سابقہ صفحات میں تفصیل سے پیش کر دیا ہے۔ ناظرین خود فیصلہ کر لیں۔ مگر اس بات میں کسی کو تامل نہیں کہ خلیفۂ وقت کو مارنے والے نہ یہودی تھے اور نہ عیسائی بلکہ وہی لوگ تھے جو کل تک انعقادِ خلافت میں بنو ہاشم کے مقابلہ پر حضرت عثمان کے ساتھ تھے۔ زیادہ حیرت انگیز تو بات یہ ہے کہ خود دار السلطنت مدینہ کے اندر مسلمانوں کا حکمراں محصور ہو کر قتل کیا جا رہا ہے اور اکابر صحابہ مہاجرین و انصار موجود ہیں مگر خلیفہ کو بچانے کی کوئی مؤثر کارروائی نہیں کی جاتی۔

ایک اہم جواب طلب سوال

تاریخ اسلام کا یہ پہلا اور آخری واقعہ ہوگا کہ ایک ہر دل عزیز حاکم اپنی پارٹی کی موجودگی میں چالیس روز تک محصور ہو کر بے دریغ قتل کیا جا رہا ہے۔ مگر اس کے خیر خواہ، عمّالِ حکومت اور ہم مشرب لوگ اس کے بچانے کی کوئی مؤثر تدبیر نہیں کرتے۔ اس سلسلہ میں فاضل مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری اپنی کتاب "الفتنۃ الکبریٰ" کے تیئیسویں باب میں یہ اہم سوال اور

پھر اس کے بعد جواب پیش کرتے ہیں :۔

"اس مقام پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے جس کا قدماء نے کوئی تسلّی بخش جواب نہیں دیا، بلکہ اکثر بزرگوں نے تو اس کا جواب دینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ لیکن بایں ہمہ ہمیں اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہی پڑیگا۔ سوال یہ ہے کہ حضرت عثمان کے عمّال نے ان کو مدد دینے میں کس طرح اور کیوں اتنی تاخیر اور سُستی روا رکھی کہ باغی حضرت عثمان کا دیر تک محاصرہ کئے رہے اور آخر کار ان کو قتل کر دینے میں کامیاب ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ محاصرہ چالیس دن تک جاری رہا۔ یہ صحیح ہے کہ ذرائع نقل و حمل آسان اور قریب نہ تھے، لیکن دوسری طرف ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خبریں حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ صوبہ جات میں پہنچ رہی تھیں۔ عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح والیِ مصر کو علم تھا کہ مصری حضرت عثمان کے خلاف غم و غصّہ کے جذبات لئے ہوئے گئے ہیں۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ انھوں نے امیر معاویہ کو اس امر کی اطلاع بھی دیدی تھی۔ اسی طرح انھوں نے حضرت عثمان کو بھی خط کے ذریعہ اس صورتِ حال سے مطلع کر دیا تھا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری نے بھی اہلِ کوفہ کو مدینہ کا رُخ کرتے دیکھا تھا۔ وہ بھی عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح کی طرح جانے والوں کے مقصد و ارادہ سے آگاہ تھے۔ یہی صورت بصرہ میں عبد اللہ بن عامر کی تھی۔ پھر آخر کیا سبب ہے کہ اتنی خبر ہونے کے باوجود یہ عمّال خلیفہ کی امداد پر بسُرعت تمام کمربستہ نہ ہو سکے۔ پھر ان عمّال کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ حضرت عثمان کی طرف سے امداد کے مطالبہ پر مشتمل خطوط ملنے کے بعد بھی تیزی سے مدینہ نہ پہنچے۔ آخر اُن لوگوں نے کیوں اتنی دیر لگائی۔ اور تساہل برتا

کہ ان کی مدد پہنچنے سے قبل ہی شر واقع ہوگیا اور امام قتل کر دیئے گئے۔

پھر ان سب اُمور سے بڑھ چڑھ کر یہ کہ عثمان نے اپنے عمّالِ حکومت کو پابند کر رکھا تھا کہ وہ حج کے دنوں میں اُن سے ضرور ملا کریں۔ آخر کیا سبب ہے کہ ان کے عمّال اس سال اپنے اپنے صوبوں میں رہے اور حج پر نہ گئے یہاں تک کہ حضرت عثمان نے محصور ہونے کی وجہ سے مجبوراً حضرت عبداللہ بن عباس کو حج کی قیادت پر مقرر کیا۔ ان سب سے بھی زیادہ حیرت انگیز و تعجّب خیز بات یہ ہے کہ مورخین کے بیان کے مطابق ابنِ عباس حضرت عثمان کی طرف سے حاجیوں کے نام ایک چٹھی لے گئے جس میں انھوں نے اپنا قضیہ پیش کیا اور اپنا بے قصور ہونا ثابت کیا تھا۔ مورّخین کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباس نے یہ چٹھی حج کے موقعہ پر لوگوں کو پڑھ کر سُنائی۔ یہ خط جس کا مکمل متن طبری نے بیان کیا ہے۔ کس طرح لوگوں نے سُن لیا اور اُن کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگی؟ سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور کوئی بھی خلیفہ کی مدد پر کمربستہ نہ ہوا؟ اور کوئی گروہ بھی مدینہ کے حادثات کا مشاہدہ کرنے کے لئے وہاں نہ پہنچا؟ یہ کیسے ہو گیا کہ حضرت عثمان کا عاملِ مکّہ خاموشی بے حسی اور اطمینان سے اِس خط کو پی گیا اور اس نے لوگوں کو خلیفہ کی امداد پر برانگیختہ نہ کیا؟ اگر وہ اہلِ مکّہ کو ہی جوش دلا کر بھیج دیتا اور وہاں کے صحرا نشینوں کا ایک لشکر جمع کر لیتا تو یقیناً یہ فوج باغیوں کو اس وقت تک مشغول کئے رکھتی جب تک کہ صوبہ جات سے باقاعدہ فوجی کمک پہنچ جاتی۔ کیا سبب ہے کہ ان میں کوئی بھی بات نہ ہوئی؟ کیا وجہ ہے کہ کسی عامل نے بھی حرکت نہ کی؟ کیا سبب ہے کہ حاجی بھی خلیفہ کی امداد پر آمادہ نہ ہوئے؟ کیا اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ تمام اُمّت

نے متفقہ طور پر اس خلیفہ کا ساتھ چھوڑ دیا تھا؟ رعیت تھک گئی تھی۔ عمّال اپنے دلوں میں کچھ اغراض چھپانے کی وجہ سے کاہلی اور سستی کر رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو اپنی پڑی ہوئی تھی اور انھوں نے خلیفہ کو مدینہ والوں کے سپرد کر دیا تھا کہ وہ جو کچھ ان کے ساتھ کرنا چاہیں کر دیں۔ یا حضرت عثمان جو کچھ ان کے ساتھ کر سکیں کر لیں۔

آپ دیکھ چکے ہیں کہ خود اہل مدینہ کی اکثریت باغیوں کے ساتھ شامل تھی۔ مدینہ میں صحابۂ کرام کی ایک مختصر جماعت ایسی بھی تھی جس نے عملاً تو حضرت عثمان کا ساتھ چھوڑ رکھا تھا لیکن زبانی وہ اس صورتِ حال پر اپنے غم و غصّہ کا اظہار کرتی تھی۔ اگر اصحابِ رسول کی یہ جماعت ہی باغیوں کے مقابلہ میں کھڑی ہو جاتی اور ان کی اُمّیدیں خاک میں ملا دیتی تو یہ باغی لوگ بے نیل و مرام واپس ہو جاتے جیسی کہ بعض قدیم مؤرخین کی رائے ہے۔ ان چیزوں کے پیشِ نظر حضرت عثمان کا وہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے کہ "لوگ میری درازیِ عمر کو لامتناہی سمجھ کر مجھ سے دل برداشتہ ہو گئے ہیں"۔ مگر غالباً لوگوں کے لیے صرف ان کی درازیِ عمر ہی ایک اُکتا دینے والا مسئلہ نہ تھا، بلکہ وہ سیاست کے اس لامتناہی سلسلہ سے دل برداشتہ ہو گئے تھے جو اُنھیں عہدِ فاروقی کی سیاست سے مختلف معلوم ہو رہی تھی اور جو اُن کی دیکھی بھالی قیصر و کسریٰ کی ملوکیت سے بھی الگ کوئی سیاست نظر آتی تھی۔ انھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان دونوں سیاستوں کے بین بین کوئی سیاست ہے"۔

(الفتنۃ الکبریٰ اردو جلد اوّل ص ۱۸۶ تا ص ۱۸۹)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے مذکورہ تحقیقی تبصرہ سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے

کہ اہلِ اسلام حضرت عثمان کی سیاست سے نالاں تھے اور خود ان کے عمّال و عمائدینِ سلطنت بھی ان کے قتل کو گوارا کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان تمام لوگوں کا مقصد پورا ہوا اور حضرت عثمان قتل کر دیئے گئے۔ اور اس عبرتناک حادثہ کے بعد فتنوں کے دروازے پاٹوں پاٹ کھل گئے۔ حرصِ ملک و ریاست اور ہوسِ بے جا نے فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم کر دیا، اور بقولِ علّامہ آزاد مرحوم "بعد میں ہونے والے محاربات جمل و صفین کا پس منظر یہی فتنۂ کبریٰ تھا، بلکہ جنگِ کربلا میں بھی جو کچھ ہوا وہ قتلِ عثمان کا ہی ردِّ عمل تھا۔"

(رسالہ نبی اور یارانِ نبی کے آخری لمحات ص۳)

اب یہاں پہنچکر تاریخ کا ادنیٰ طالبِ علم بھی یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ مورخین کے بیانات ابنِ سبا کے متعلق اگر تسلیم کر لیئے جائیں کہ حضرت عثمان کی مخالفت اور ان کے سنسنی خیز قتل کے علل و اسباب عبداللہ بن سبا ہی کے اقدامات تھے تو بجائے اس کے کہ جس غرض کے لئے یہ افسانہ تراشا گیا ہے وہ پوری ہو خود ان افسانہ نگاروں ہی کی کاکلِ ارادت میں بَل پڑتے نظر آتے ہیں۔ اور صحابیت کے متعلق جو حُسنِ ظن ہے وہ ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ مورخین کے عائد کردہ الزامات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس نو مسلم یہودی نے نفاق کا لباس اوڑھ کر اسلامی مشیروں میں آگ لگا دی۔ اور اپنی شعلہ بار تقریروں سے علاوہ ابوذرؓ اور عمارؓ یاسر کے طلحہ و زبیر عبدالرحمٰن ابن عوفؓ دیگر اجلّہ صحابہ کرام اور خاصکر ام المؤمنین حضرت عائشہ کو بھی اپنے جھانسے میں لے لیا اور سب کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ اسلامی مملکت کے سربراہ کو قتل کر دیں اور اس یہودی کے دامِ فریب میں آکر اسلامی تعلیمات سے انحراف کر بیٹھیں۔ ان سب باتوں کو سامنے رکھکر ہم تو اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ابنِ سبا کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ جس کا جی چاہے ان خلافِ عقل و نقل الزامات کو تسلیم کرے مگر ہم تو صدرِ اوّل کے مسلمانوں کو اس سے کہیں بلند و بالا خیال کرتے ہیں کہ ایک نو مسلم یہودی آنِ واحد میں مسلمانوں کے دین کو

غارت کر دے اور ان کے جذبات کو آلۂ کار بنا کر اپنی اسلام دشمنی کے جذبات کو تسکین دے۔

حقیقت میں یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو عقل کی کسوٹی پر ثابت نہیں ہوتیں اور نہ تنقید کی تاب لا سکتی ہیں۔ لہٰذا ان باتوں پر تاریخی امور کی بنیاد استوار کرنا درست نہیں بلکہ یہ مناقشات اور اس دور کے مسلمانوں کے باہمی اختلافات ان کی اُفتادِ طبع اور قلبی رُجحانات کا ہی نتیجہ ہیں۔ ابن سبا وغیرہ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ حُسنِ عقیدت کی بنا پر ان امور کو خواہ خطائے اجتہادی سے تعبیر کیا جائے یا کسی اور شرعی اصطلاح سے ان کو یاد کر لیا جائے۔ اس سلسلہ میں نقّاد مورّخ طٰہٰ حسین فرماتے ہیں:۔

"در اصل واضح بات جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں یہ ہے کہ اِس دَور کی اسلامی زندگی کے حالات طبعی طور پر اختلافِ آراء افتراقِ اہواء اور گوناگوں سیاسی مذاہب کے ظہور کی طرف مائل تھے، ایک طرف تو وہ لوگ تھے جو قرآن و سنّت نبوی اور سیرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے وابستہ تھے اور وہ ایسے نئے امور وقوع پذیر ہوتے دیکھ رہے تھے جن سے ان کا سابقہ نہیں پڑا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان حالات کا اِس طرح حزم و احتیاط۔ قوت و شدّت۔ بے غرضی اور خوش انتظامی کے ساتھ مقابلہ کیا جائے جس طرح حضرت عمر کیا کرتے تھے۔ دوسری طرف قریش اور عرب قبائل کے نوجوان تھے جو نئی صورتِ حال سے نئے جذبات کے ساتھ دوچار ہو رہے تھے۔ ایسے جذبات جن میں طمع۔ مراتبِ عالیہ کا حصول۔ خود غرضی و خود پرستی، خوش رنگ امّیدیں۔ کسی حد پر نہ ٹھہرنے والی خواہشیں مِلی جلی تھیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ان جذبات میں رشک و رقابت اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی تمنّا بھی شامل تھی۔ یہ باہمی مقابلہ محض

بلند مناصب کے حصول ہی کے لئے نہیں تھا بلکہ ماحول کی ہر شئے کو حاصل کرنے کے لئے موجود تھا۔ یہ نئی صورتِ حال فی نفسہٖ اس قابل تھی کہ برنا و پیر کو اس ڈھرّے پر لگا دے جس کی جانب وہ چل پڑے تھے۔

ذرا غور کیجئے کہ وسیع علاقے فتح ہو رہے تھے، ان علاقوں سے بے حساب دولت خراج کی شکل میں ان کے پاس وصول ہو کر پہنچ رہی تھی اس صورتِ حال کے پیشِ نظر اگر ان علاقوں میں نظمِ حکومت چلانے اور اس جمع شدہ مال سے مستفید ہونے کی غرض سے لوگ باہم رشک رقابت کے جذبات میں مبتلا تھے تو اس میں تعجّب کی کونسی بات ہے؟ پھر دوسری طرف وہ ممالک بھی تھے جو ابھی فتح نہیں ہوئے تھے۔ اور صورتِ حال اس امر کا تقاضہ کر رہی تھی کہ مسلمان انھیں بھی دوسرے علاقوں کی طرح زیرِ نگیں کر لیں۔ تو پھر وہ لوگ فتح کے ضمن میں کیوں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوشش نہ کریں۔ ان میں جو لوگ طالبِ دنیا تھے وہ کیوں فاتحین کی مجد و عزّت اور مالِ غنیمت کے بارے میں رقیبانہ رویّہ اختیار نہ کرتے؟ جو طالبِ آخرت تھے وہ کیوں اجر و ثوابِ آخرت کے طلب گار نہ ہوتے؟ لہٰذا اگر طامع و بلند نگاہ نوجوانانِ قریش ان راہوں سے داخل ہو کر جو اُن کے سامنے کھلی تھیں عظمت، تسلّط اور ثروت حاصل کرنا چاہتے تھے تو یہ کونسے اچنبھے کی بات ہے۔ اسی طرح اگر انصار اور دوسرے عرب قبائل کے نوجوانوں میں مقابلہ و مسابقت کی رُوح بیدار ہو رہی تھی تو اس میں کونسی انوکھی بات تھی؟ اور پھر جب یہ دیکھکر کہ خلیفۂ اسلام ان کے اس جذبۂ مسابقت میں حائل ہو رہے ہیں یا وہ اہم معاملات میں قریش کو اور اس سے زیادہ عظیم الحیثیت اُمور میں

صرف بنو امیہ کو ترجیح دے رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں دردِ محرومی اور غیرت و غضب کی آگ بھڑکے تو اس میں کونسا عجوبہ ہے؟

بلا شک حضرت عثمان نے حضرت سعد کو کوفہ سے معزول کر کے ان کی جگہ ولید اور سعید کو والی مقرر کیا، ابو موسیٰ کو بصرہ سے معزول کر کے عبداللہ بن عامر کو ان کا جانشین مقرر کیا۔ تمام ملکِ شام متحد کر کے اور امیر معاویہ کے سپرد کر کے ان کے تسلّط کی حتی الامکان توسیع کی۔ حالانکہ قبل ازیں شام کئی صوبوں میں منقسم تھا۔ اور اس کی حکومت میں قریش کے ساتھ دوسرے عرب قبائل بھی شریک تھے۔ اس طرح حضرت عثمان نے مصر سے عمر بن العاص کو معزول کر کے عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کا تقرر کیا، اور یہ سب والی حضرت عثمانؓ کے اقرباء میں سے تھے، کوئی ماں کی طرف سے بھائی تھے اور کوئی رضاعی بھائی، کوئی ماموں تھے اور کوئی بنو عبد الشمس سے نسبتِ قریبہ رکھنے کی وجہ سے اُن کے ہم نسب تھے۔ یہ سب وہ حقائق ہیں جن سے مجالِ انکار نہیں ہے۔

یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ حضرت عثمان نے جن لوگوں کو مقرر یا معزول کیا تھا ابنِ سباء کے ایماء سے نہیں کیا تھا۔ سیدھی سی بات ہے کہ جب بھی شاہوں۔ قیصروں۔ والیوں اور امراء نے امورِ حکومت میں اپنے اقرباء کو ترجیح دی ہے۔ لوگوں نے اسے ہمیشہ ناپسند کیا ہے۔ اس اعتبار سے حضرت عثمان کی مسلم رعایا نے عامۃ الناس سے ہٹ کر کوئی انوکھی بات نہ کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے بھی ہر زمانہ کے عام انسانوں کی طرح بعض معاملات کو ناپسند کیا اور بعض کو تسلیم کیا۔"

(الفتنۃ الکبریٰ، جلد اوّل، حالاتِ عثمان، ص ۲۹۱-۲۹۲ مطبوعہ ادارہ طلوعِ اسلام لاہور۔ مترجم پروفیسر محمد منور ایم۔ اے)

حضرت علیؑ اور انعقادِ خلافت

حضرت عثمان کے قتل اور ابنِ سبا کے معاملہ میں جہاں دیگر گوناگوں الزام تراشے گئے، وہاں ابوذرؓ، عمارؓ یاسر ایسے پاکباز صحابہ کے علاوہ برادرِ رسولؐ اور اسلام کے بطلِ جلیل جناب امیر المؤمنین علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام کو بھی معاف نہیں کیا گیا۔ ابن سباء کے قصہ کو ہوا دینے والے گروہ نے لکھا ہے کہ حضرت عثمان کے قتل ہو جانے کے بعد تختِ خلافت پر حضرت علی علیہ السلام کو متمکن کرنے والے یہی ابن سبا اور اس کے ساتھی سبائین ہی تھے۔ گویا اکابر صحابہ مہاجرین و انصار نے بیعتِ خلافت میں حصّہ نہیں لیا بلکہ انھوں نے تقاعد اختیار کیا اور ابن سبا کی منظم پارٹی (جس کے ممتاز نمائندے۔ عمارؓ یاسر۔ مالکؓ اشتر۔ حجرؓ بن عدی۔ صعصعہؓ بن صوحان اور عمروؓ ابن الحمق وغیرہ پاکباز مؤمنین تھے) سیاستِ وقت پر اثر انداز رہی اس اجمال کی تفصیل وہ نام نہاد مصنّفین و مورخین اس طرح بیان کرتے ہیں کہ حضرت امیر علیہ السلام ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ سلطنتِ اسلامیہ کی باگ ڈور ہاتھ میں لیں مگر اس شر انگیز پارٹی نے حضرت علیؑ کو مجبور کیا کہ وہ بیعتِ خلافت حاصل کر لیں بصورتِ دیگر انھیں بھی حضرت عثمان کی طرح قتل کر دیا جائے گا۔

جس شخص نے دینی بصیرت اور اسلامی جذبات کے ماتحت اعلانِ نبوّت سے لیکر وفاتِ رسولؐ تک تاریخِ اسلام اور اقوالِ رسولؐ کا مطالعہ کیا ہے وہ اچھّی طرح جانتا ہے کہ حضرت علی علیہ السّلام کی دینی پوزیشن۔ ان کا علم و عمل۔ عزم و استقلال حلم و شجاعت۔ غرضیکہ ان کا جامع کردار ان باتوں سے بہت بلند ہے کہ وہ نہایت سادہ لوحی کے ساتھ ایک یہودی کے کہنے اور اس کی پارٹی کے ورغلانے یا دھمکانے پر ایک ایسے مقام پر بیٹھنے کا ارادہ کریں۔ جس کے لئے اربابِ حل و عقد اور مہاجرین

و انصار ان کے خلاف ہوں اور وہ نہ چاہتے ہوں اور زبردستی خلیفہ بن بیٹھیں۔

شیعی نقطۂ نظر اور اس کے مکتبِ خیال کے اعتبار سے حضرت علی علیہ السلام دیگر اوصیاء کی طرح وصیِ رسولؐ، منصوص من اللہ والرسول خلیفہ تھے۔ ان کی خلافت و امامت کسی کے بیعت کر لینے کی محتاج نہ تھی کیونکہ منصب خداوندی کے عہدہ دار ہر اعتبار سے اس منصبِ جلیلہ پر قائم رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اقتدار شرط نہیں۔ بلکہ خلیفۂ رسولؐ کے لیے ابقاء شریعت کا ضامن اور حفاظت دین و اسلام کا کفیل ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں شیعی مسلک کی ترجمانی ہم سابقہ اوراق میں پیش کر چکے ہیں۔ اس مقام پر ہم اس بات کو واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے ناگوار حادثۂ قتل کے بعد حضرت علی علیہ السلام کو مہاجرین و انصار اور امتِ اسلام کی اکثریت نے خلیفہ بنایا تھا۔ اور جمہورِ اسلام کا یہی عقیدہ آج تک چلا آیا ہے۔ ذیل میں چند ایک اکابرین ملت کے خیال کو ہم تائید کے طور پر پیش کرتے ہیں:۔

علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:۔

"حضرت علیؑ کی بیعت عثمان کے قتل ہونےکے فوراً بعد ہی اوائلِ ذی الحج میں واقع ہوئی۔ آپ کی بیعت تمام مہاجرین و انصار اور ہر اُس شخص نے کی جو مدینہ میں اس وقت موجود تھا۔ اور آپ کی بیعت کی اطلاع تمام اسلامی ممالک میں ہو گئی۔ ہر مقام کے مسلمانوں نے آپ کی اطاعت سوائے معاویہ بن ابو سفیان کے بطیب خاطر قبول کی"۔

(فتح الباری جلد ۷ ص ۵۷۶)

شیخ شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے فرزند محدث جلیل شاہ عبد العزیز صاحب تحفہ اثناء عشریہ فرماتے ہیں:۔

"قتلِ عثمان کے بعد حضرت علیؑ کی بیعت کرنے والے مخلص صحابہ

اور مہاجرین و انصار تھے ان کا مذہب یہ تھا کہ حضرت امیر علیہ السلام عثمان کی موت کے بعد امام حق ہیں اور آنجناب کی اطاعت تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ خلافتِ مرتضیٰؑ تمام اہل حل و عقد مہاجرین و انصار اور طلحہ و زبیر کے اتفاق سے منعقد ہوئی۔ طلحہ و زبیر کا بعد میں خروج کرنا انکار کے سبب سے نہیں تھا بلکہ وہ خلافت کو تو تسلیم کر چکے تھے، البتہ خونِ عثمان کا مطالبہ وہ ضرور کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں صاحبِ استیعاب نے لکھا ہے "بویع لعلی علیہ السلام بالخلافۃ یوم قتل عثمان واجمع علی بیعتہ المہاجرون والانصار" (حضرت علی علیہ السلام کی بیعت قتل عثمان کے روز ہی مہاجرین و انصار کے اتفاق سے ہوئی۔)

(قرۃ العینین ص۱۹۴ و تحفۂ اثناء عشریہ ص۱۸)

عصر حاضر کے مشہور مورخ ڈاکٹر طہ حسین جنھیں غیر معمولی تاریخی بصیرت حاصل ہے وہ بھی انعقاد خلافتِ علویہ پر اسی رنگ میں اپنا موقف ظاہر کرتے ہیں:۔

"مہاجرین و انصار نے دیکھا کہ اب بغیر خلافت کا مسئلہ طے کئے چھٹکارا نہیں۔ ان میں سے ہر شخص نے اپنی جگہ پر سوچا پرکھا اور صحابہ سے بھی جن سے ملاقات ہو سکی صلاح و مشورہ لیا۔ پتہ چلا کہ وہ سب حضرت علیؑ کی طرف مائل ہیں۔" (علی و بنوہ ص۹)

پھر آگے چل کر ایک مقام پر لکھتے ہیں:۔

"تمام مہاجرین و انصار کے علاوہ طلحہ و زبیر نے بھی بخوشی بیعت کر لی تھی، اور ان دونوں کو مجبور نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ ان دونوں نے بعد میں دعویٰ کیا اور جیسا کہ بہت سے راویانِ حدیث بیان بھی کرتے ہیں۔ پھر جب انھوں نے دیکھا کہ خلیفہ (علیؑ) ہماری امیدوں کو خاک میں ملا رہے ہیں تو

ان کی رائے بدل گئی"۔ (الفتنۃ الکبریٰ جلد دوم ص۲۱)

اب جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کرنے والے شر پسند سبائی تھے وہ اپنے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں اور مہاجرین و انصار پر بھی۔ اپنے اوپر تو اس لئے کہ انھوں نے جمہورِ اسلام کے خلاف اور مسلکِ اعتدال سے ہٹی ہوئی راہ اختیار کی ہے اور مہاجرین و انصار پر اس لئے کہ ان قرآن و حدیث کے بلا واسطہ مخاطبین پر سبائیت شر پسندی اور فتنہ انگیزی کا الزام عائد کر دیا، اور واشگاف الفاظ میں یہ لکھدیا کہ عمارؓ یاسر مالک اشترؓ۔ محمدؓ بن ابی حذیفہ۔ حجرؓ بن عدی۔ محمدؓ ابن ابی بکر۔ صعصعہؓ بن صوحان اور عمروؓ ابن الحمق وغیرہ اصحاب رسولؐ و اصحاب امیر المومنینؑ سبائیت کے لباس میں ملبوس تھے۔ ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ جب علم و تحقیق کے علمبردار انتہائی تعصب کے ساتھ صحیح تاریخ نویسی کی روش سے ہٹ کر سرے سے واقعات پر ہی پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں اور محض اپنے ذہنی رجحان کو ہی سامنے رکھکر فیصلہ صادر کرتے ہوئے کسی کو فتنہ پرور لکھ ڈالتے ہیں تو انھیں کیوں خوفِ خدا دامنگیر نہیں ہوتا؟

ذیل کی سطور میں ہم کتبِ رجال اور تاریخ سے مذکورۂ بالا اصحابِ رسولؐ و اتباع امیر المومنینؑ کا قدرے تعارف کرا کے یہ ثابت کئے دیتے ہیں کہ یہ مقدس مومنین اعلیٰ کردار اور بلند عظمت کے مالک تھے، اور ان کو محض اس لئے نشانہ بنایا جاتا ہے کہ یہ لوگ حضرت امیر المومنینؑ کے دست و بازو اور آنحضرتؐ کی دینی و سیاسی پوزیشن میں ان کے متبع اور ہم خیال تھے۔

حضرت عمار یاسرؓ

ڈاکٹر طٰہٰ حسین فتنہ و فساد کے ایام میں حضرت عمارؓ یاسر کی دینی و سیاسی پوزیشن، ان کے کردار اور اعلیٰ شخصیت پر تبصرہ فرماتے ہوئے اپنی ایک دوسری تصنیف "الوعد الحق" میں رقمطراز ہیں:۔

"فتنہ بپا ہونے کے بعد اہل مدینہ میں کسی نے حضرت عثمان کی اسقدر

سختی سے مخالفت نہیں کی جتنی کہ حضرت عمارؓ یاسر نے کی وہ جیسا کہ نبیؐ نے فرمایا تھا کہ "صحیح فطرت پر قائم تھے" ہر قسم کی تاویل اور قیاس آرائی کو ناپسند کرتے تھے اور تاویل کرنے والوں سے بھی سخت نفرت کرتے۔ قول اُن کو وہ پسند تھا جو کھرا اور بے لاگ ہو، عمل وہ جو واضح اور بیّن ہو، سیرت وکردار وہ جو ہر قسم کی کجروی اور الجھاؤ سے پاک اور راستی پر قائم ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ دینِ خالص اُن کی فطرت میں داخل تھا۔ اور دینداری ان کی طبیعت کا خمیر تھی۔ وہ دنیا کے معاملہ میں سب سے زیادہ زہد شعار اور حصولِ منافع کی فکر سے قطعاً بے نیاز تھے۔ فتنہ وفساد سے بے حد خائف اور سیاسی جوڑ توڑ اور اس کی الجھنوں سے بالکل کنارہ کش رہتے حق بات کو پسند کرتے اور اسی کیلئے سعی وکوشش کرتے۔ انھوں نے نبیؐ کی پاک سیرت اور شیخین کی زندگی میں استقلال دیکھا تھا جس میں کسی قسم کی کجی نہ تھی۔ ان کی پالیسی بالکل واضح اور ہر قسم کے الجھاؤ سے پاک تھی۔ لہٰذا وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ حاکم کی ہمیشہ ایک متعین اور واضح پالیسی ہونی چاہیئے جیسا کہ نبیؐ اور آپ کے دونوں جانشینوں کی تھی۔ لیکن جب سے حضرت عثمان کے زمانہ میں انھوں نے ملکی معاملات میں بے انتظامی بے ترتیبی اور الجھاؤ دیکھا۔ لوگوں میں نفع اندوزی اور حصُولِ زر کی آگ پھیلتی دیکھی اور جذبات وخیالات کا انتشار نظر آیا تو یہ ان پر بہت گراں گزرا۔ ان کا دل اسے ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہ کرسکا۔ اور ان کی سادہ فطرت اس صورتِ حال سے مطمئن نہ ہوسکی۔ اس کی وجہ سے عجیب عجیب خیالات ان کے دل میں پیدا ہونے لگے۔ مگر انھوں نے طویل خاموشی اختیار کرکے ان معاملات سے کنارہ کش رہنا چاہا۔ خدا سے پناہ بھی مانگی

کہ وہ اس فتنہ وفساد سے محفوظ رکھے۔ لیکن وہ لوگوں سے ملے اور انکی باتیں سُنیں تو معلوم ہوا کہ وہ بھی ان باتوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ پھر تو عمارؓ اس معاملہ پر بہت سنجیدگی سے غور کرنے لگے۔ صورتِ حال کا جائزہ لیا تو اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان باتوں کی مخالفت کرنی چاہیئے۔ لیکن پھر بھی انھوں نے کافی عرصہ خاموشی اختیار کیئے رکھی اور فتنہ وفساد سے پناہ مانگتے رہے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ رسولؐ اللہ کے بزرگ و معمر اصحاب خصوصاً مہاجرین بھی ان چیزوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو اپنی صحیح رائے کا انھیں یقین ہو گیا۔ ایک روز مدینہ میں چرچا ہوا کہ حضرت عثمان نے بیت المال سے کچھ جواہرات لیئے ہیں اور ان سے اپنی بیوی کا زیور بنوایا ہے۔ انصار و مہاجرین نے اس پر خوب باتیں بنائیں۔ اس کی خبر حضرت عثمان کو ہوئی تو ایک روز منبر پر چڑھ کر کہنے لگے۔

"ہمیں جو ضرورت ہوگی بیت المال سے لے لیں گے خواہ لوگ کتنے ہی مخالف ہوں"۔ حضرت علیؑ نے کہا کہ "پھر تو تمھیں اس سے روکا جائیگا"۔ حضرت عمارؓ بولے "خدا کی قسم میں پہلا مخالف ہونگا جو تمھیں روکونگا"۔

حضرت عثمان حضرت علیؑ کی بات پر تو خاموش رہے لیکن حضرت عمارؓ کی گفتگو سے برافروختہ ہو گئے۔ اور ان کو بہت بُرا بھلا کہا۔ اور جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے کہ یہی اُس فساد کی ابتداء ہے جس کا انجام اس صورت میں ظاہر ہوا کہ حضرت عثمان نے حضرت عمارؓ کو اس قدر مارا کہ اُن کا سر پھٹ گیا اور بے ہوش ہو گئے۔ ظہر عصر اور مغرب کی تین نمازیں بھی ان سے قضا ہو گئیں لیکن پھر جب افاقہ ہوا اور ہوش میں آئے تو وضو کیا اور تینوں نمازیں اکٹھی پڑھیں۔ اور اُن آزار و تکالیف کا ذکر کیا جو اسلام

لانے کے بعد کفار قریش سے اُنھیں پہنچی تھیں۔ اس روز سے انھوں نے خاموشی ترک کی اور اُٹھتے بیٹھتے ہر جگہ حضرت عثمان پر تنقیدیں کرنے لگے بالآخر حضرت عثمان سے انتقام لینے والے باغی گروہ جب تمام صوبوں سے اکٹھے ہو کر مدینہ آئے تو حضرت عمارؓ نے ان سے کوئی اظہارِ نفرت نہ کیا اور نہ انھیں واپس کرنے کی کوشش کی پھر حضرت عثمان قتل ہو گئے تو ان کے قتل پر بھی انھیں کوئی افسوس نہ ہوا، بلکہ بعض اوقات تو وہ اس بات پر جھگڑتے تھے کہ حضرت عثمان حالتِ ایمان میں قتل ہوئے یا حالتِ کفر میں۔"

(الوعد الحق اردو ص ۳۲۹/۳۴۰ مطبوعہ کراچی)

یہ تھا وہ مسلک موقف حضرت عمارؓ کا جو انھوں نے فتنہ و فساد کے زمانہ میں اختیار کیا تھا۔ فاضل مورخ نے صحابیِ رسولؐ کا جو کردار پیش کیا ہے۔ واقعی اس قابل ہے کہ اسے آبِ زر سے لکھا جائے۔ اس حقیقت کشا بیان سے ظاہر ہے کہ حضرت عمارؓ یا مثل اُن کے دوسرے جلیل القدر صحابہ جو حضرت عثمان سے خوش نہ تھے۔ ان کا سبائیت سے دُور کا بھی لگاؤ نہیں تھا۔ انھوں نے از خود کبھی بھی سازشوں اور خفیہ سکیموں میں حصّہ نہیں لیا۔ بلکہ وہ حکومتِ وقت کے ساتھ اُس حد تک معاون رہے جس حد تک کہ ایک وفادار شہری کسی حکومت کا ساتھ دے سکتا ہے۔ انھوں نے اپنی زبانوں کو اُسی وقت کھولا جبکہ پانی سر سے اونچا ہو گیا اور ان پر ظلم و ستم ڈھائے جانے لگے۔ ان کا حضرت عثمان اور ان کے ہم خیال سیاسی گروہ کی مخالفت کرنا اور حضرت امیر علیہ السّلام کا ساتھ دینا ان کے اپنے علم و یقین اور مذہبی مسلک کے عین مطابق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمارؓ وفاتِ رسولؐ سے ہی مسلکِ اہلِ بیت پر گامزن تھے اور آخری سانس تک اپنے آقا کی معیّت میں باغیوں کے مقابلہ میں جامِ شہادت نوش کیا۔ کتبِ صحاح مسانید اور سیر و تواریخ میں مخبر صادق کی ایک پیشین گوئی ملتی

ہے، جس سے حضرت عمار کی دینی عظمت اور ان کے مخالفین کی ضلالت وگمراہی کا علم ہوتا ہے۔ جناب پیغمبر اسلام فرماتے ہیں "اے عمار! تجھے ایک باغی گروہ قتل کریگا تو تو انھیں جنّت کی دعوت دیگا مگر وہ تجھے جہنّم کی طرف بلائیں گے"۔

(صحیح بخاری جلد ۱ ص ۶۶ طبع مصر)

پیغمبر اسلام کی یہ پیشین گوئی صفین میں پوری ہوئی اور متکلمین اسلام کے نزدیک یہ خبر غیب دلائل نبوّت میں سے ایک ہے۔ اب جس کا جی چاہے ایسے مبشر بالجنّۃ انسان کو شر انگیز یا فتنہ باز یا دوسرے الفاظ میں سبائی کہہ لے۔ ہم تو ایسی باتوں کو درخورِ اعتناء خیال نہیں کرتے۔

مالک اشتر کا کردار

مالک اشتر پیغمبر اسلام کی صحبت سے شرف یافتہ جلیل القدر انسان تھے۔ اور یہ ایسے مقدس و دیندار بزرگ ہیں کہ جس نے بھی آپ کا ذکر کیا خیر و خوبی کے ساتھ ہی کیا۔ آپ کے علوِ مرتبت اور جلالتِ قدر کے تعارف کے لئے حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام کا مخلص جانثار ہونا ہی کافی ہے۔ جناب امیر المومنین کی مدح و ثنا میں ڈوبی ہوئی نظمیں جو اشتر کی زندگی اور ان کے مرنے کے بعد ان کی عظمت کے متعلق فرمائی گئیں بطورِ سند پیش کی جا سکتی ہیں۔ نہج البلاغۃ کے اوراق سامنے ہیں ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ حضرت امیر المؤمنین فرمایا کرتے تھے۔

"رحم اللہ مالکاً فلقد کان لی کما کنت لرسول اللہ"۔

(خداوندِ عالم مالک پر رحم فرمائے وہ میرے لئے ایسے ہی تھے جیسا کہ میں خود رسول اللہ کے لئے تھا۔) (شرح ابن ابی الحدید جلد ۳ ص ۴۱۶)

ایسے پاکباز انسان کے متعلق بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قتلِ عثمان میں پیش پیش تھے اور بلوائیوں کی کمان انہی کے ہاتھ میں تھی۔ دوسرے الفاظ میں

سبائی گروہ کے لیڈر اور ان کے سرغنہ تھے۔ جہاں تک مخالفتِ عثمان اور قتل کے واقعات کا تعلق ہے تاریخی معلومات کے اعتبار سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان کا حصّہ ان واقعات میں نہ ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ دیگر مہاجرین و انصار کی طرح یہ بھی اربابِ اقتدار کے کھلّم کھلّا مظالم کے شاکی ہوں اور شرعی جواز کے ہوتے ہوئے قتل کرنیوالوں کے ساتھ شریک ہو گئے ہوں۔ مگر خفیہ سازشوں اور حیلہ سازیوں میں ان کا شامل ہونا ان کے بلند کردار کے منافی تھا۔ کیونکہ حضرت امیر المومنینؑ کی صحبت نے اس پاکباز انسان کو بے مثل بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کمال عقل و شجاعت و بزرگی و فضائل سے متّصف ہونے کے علاوہ زیورِ حلم۔ زہد۔ فقر اور دُور اندیشی سے بھی آراستہ تھے۔ اسی واسطے جب ان کی شہادت کی خبر امیر المومنینؑ کو پہنچی تو آپ نے فرمایا "خدا مالک پر رحم کرے ان کی جدائی میرے لئے بہت شاق ہے۔ اور ان کی موت نے میری کمر کو توڑ ڈالا ہے"۔

مصر کے نامور مورخ اور ادیب استاد عبدالفتاح عبدالمقصود جن کی کتابوں سے ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے بھی استفادہ کیا ہے۔ مالک اشترؓ کی سیاسی پوزیشن اور ان پر وارد شدہ الزامات کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"حقیقت یہ ہے کہ مالک اشترؓ متقی۔ پرہیزگار۔ امین و دیانتدار انسان تھے اور حضرت عثمان کی مخالفت سے محض خدا کی خوشنودی حضرت عثمان کی بھلائی اور مسلمانوں کی بہبود تھی اور ان کے کردار اور سیرت کے شایاں بھی تھا اور امیر المومنینؑ نے جو اُن پر اتنا گہرا اعتماد کیا وہ بھی ان کی بلند کرداری اور پاکیزگیٔ سیرت کی وجہ سے تھا۔ وہ حضرت علی علیہ السلام کی فراست۔ لوگوں کے نفسیات و طبائع کو بہت اچھی طرح سمجھتے تھے۔ علیؑ جو محمد مصطفٰیؐ کے مقربِ بارگاہ اور سب سے بڑھ کر اُن کے چہیتے تھے۔ اور

محمد مصطفیٰؐ کے بعد فضائل و عادات کے لحاظ سے سب سے بڑھ کر پاک و پاکیزہ اور طاہر و مطہر تھے۔ کیا ان کے متعلق کسی کو گمان بھی ہو سکتا کہ وہ ایک غدار شخص کو اپنا مقرب بارگاہ بنائیں اور سب سے بڑھ کر اپنا مخلص سمجھیں۔ مالکؓ کی شہادت (جو امیر شام کے ہاتھوں ہوئی) کی خبر سُن کر علیؑ نے کہا تھا "کان الاشتر لی کما کنت لرسول اللہ" اصل بات یہ ہے کہ جتنی روایتیں مالک اشترؓ کے دامن کو داغدار بناتی ہیں۔ وہ سب وہم کی پیداوار ہیں یا پھر ایسے عقل کی اختراع ہیں جو افتراء و بہتان کی دلدادہ اور سپید جھوٹ کی عادی ہیں۔ اور ان تمام روائیتوں کی غرض و غایت محض یہ ہے کہ اشترؓ کی جو قدر و قیمت اور منزلت تھی وہ گھٹ جائے اور بنو امیہ کی فطرت و طبیعت سے یہ چیز کوئی بعید بھی نہیں۔"

(الامام علی ابن ابی طالب جلد سوم بحوالہ اموی دور خلافت جلد اص ۱۴۹)

جناب مالک اشترؓ کی دینی و سیاسی پوزیشن واقعی ہی ایسی تھی جیسا کہ اقتباس بالا میں استاد عبدالفتاح کے حقیقت افروز بیان سے ظاہر ہے۔ اگر ابن سبا وغیرہ کی کوئی سازش حکومتِ وقت کے خلاف تھی بھی تو اس میں اشترؓ کی شرکت سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ اس کا ثبوت خود مالکؓ اشتر کا کردار اور علیؑ ابن ابی طالبؑ کی سیرت ہے۔ مالک اشتر بھی انہی اکابرینِ اسلام سے تھے جو حضرت عثمان کی بے توجہی اور ان کے مقرر کردہ گورنروں کے مظالم کے شاکی تھے۔ جس طرح ہر شہر اور صوبہ کے باشندے اپنے یہاں کے گورنروں کی زیادتیوں پہ ناراض تھے۔ اس طرح اشترؓ بھی اپنے شہر کے گورنر سعید ابن عاص کے مظالم سے تنگ تھے۔ جس طرح دیگر شہروں کے مسلمان فریاد لیکر دربارِ خلافت میں پہنچے اُسی طرح یہ بھی۔ یہ اشترؓ ایسے انسان نہ تھے جن کا ظاہر کچھ ہو اور باطن کچھ۔ جو سازشی کارروائیوں کا ماہر ہو۔ یہ تو بہادر جوان مرد تھے جو دل میں ہوتا علانیہ کہہ دیتے۔ چاہے علانیہ

اظہار میں ان کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچتا ہو، اور خلیفۂ وقت اور ان کے حاشیہ نشینوں کے غیظ و غضب کا نشانہ ہی کیوں نہ بننا پڑے۔

مالک اشترؒ حکومت کے باغی نہیں تھے، انھوں نے کسی وقت بھی بے جا طور پر خلیفۂ وقت کی اطاعتِ مشروطہ سے انحراف نہیں کیا۔ وہ اس حکومت کے اتنے ہی وفادار تھے جتنا کہ ایک دیندار انسان مہذّب شہری ہونے کی حیثیت سے ہو سکتا ہے مگر جب مقرر کردہ شرائطِ خلافت یعنی کتاب اللہ۔ سنّتِ رسولؐ اور سیرتِ ابوبکر و عمر سے یکسر انحراف کیا جانے لگا تو مجبوراً اشترؒ نے بھی وہی کیا جیسا کہ دوسروں نے حضرت عثمان کی سیاست پر کھل کر تنقید اور اعتراضات کیے۔

دیکھیے جب حضرتِ عثمان نے مالک اشترؒ اور ان کے رفقاء کے نام ایک خط لکھّا جس میں انھوں نے اطاعت و فرمانبرداری کی تلقین کی تھی اور خدا سے ڈراتے ہوئے لکھّا تھا کہ تم ہی لوگوں نے افتراق و اختلاف کی ابتداء کی ہے۔ اس کے جواب میں مالک اشترؒ نے جو خط خلیفۂ عثمان کو لکھا ذیل میں اس کا متن بلاذری کی سند سے پیش کیا جاتا ہے:۔

"مالک حارث کی طرف سے بخدمت آزمائش میں پڑے ہوئے خطا کار سنّتِ رسولؐ سے گریزاں اور حکم قرآنی کو پسِ پشت ڈال دینے والے خلیفۃ المسلمین۔ امّا بعد۔ ہم نے آپ کا خط پڑھا۔ آپ اپنے آپ کو اور اپنے حکّام کو ظلم و زیادتی سے باز رکھیں اور نیک سیرت افراد کی جلاوطنی سے رُک جائیں تو ہم آپ کے تابعِ فرمان بن جائیں گے۔ آپ نے کہا ہے کہ ہم نے اپنے نفوس پر زیادتی کی ہے، یہ آپ کی وہ خوش خیالی ہے جس نے آپ کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اسی وجہ سے آپ کو جَور عدل، اور باطل حق دکھائی دیتا ہے۔ اگر آپ ہماری محبّت چاہتے ہیں تو وہ اسی شکل میں ممکن ہے کہ آپ اپنے طرزِ عمل سے باز آئیں۔ تائب ہوں

اور آپ نے ہمارے جن نیک چلن افراد پر ظلم و زیادتی کی ہے اور ہمارے جن نیک اشخاص کو بے گھر کر کے جلاوطن کیا ہے اس پہ خدا کے سامنے معافی کے طلبگار ہوں۔ ہم پر کل کے لونڈوں کو حاکم نہ بنائیں۔ ہمارے علاقہ کا انتظام حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت حذیفہؓ کے سپرد کر دیں کہ ہم ان دونوں پر راضی ہیں۔ ہمیں اپنے ولید۔ سعید اور اپنے خاندان کے دیگر محبوب نظر افراد سے بچائیے۔ آگے جو خدا کی مرضی۔ والسلام۔

(انساب الاشراف بلاذری جلد ۵ صفحہ ۴۶ مطبوعہ قدس۔ الفتنۃ الکبریٰ جلد اول اردو صفحہ ۲۸)

اس کے بعد طٰہٰ حسین فرماتے ہیں :۔

"آپ نے دیکھ لیا کہ اشترؒ نے حضرت عثمان کی اطاعت سے روگردانی نہیں کی، نہ ان کی امامت سے انکار کیا۔ البتہ اس نے جور و ستم۔ سنت سے انحراف۔ احکام قرآنی سے اعراض اور مناصب حکومت پر نوخیزوں کی تقرری اور مسلمانوں کی جلاوطنی کا الزام لگا کر ان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اس طرز عمل سے باز آجائیں۔ اور یہ استدعا کی ہے کہ ابو موسیٰ اشعری کو والی صلاۃ و حرب اور حذیفہ بن یمان کو والی خراج مقرر کر دیں۔ اور بتایا ہے کہ اگر یہ مطالبات مان لئے جائیں تو اہل کوفہ ان کی اطاعت کرتے رہیں گے"۔ (عثمان صہ ۲۸)

اس قدر اجلہ محقق مورخین کی واضح شہادتوں کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ مالک اشترؒ سبائی گروہ کے سرغنہ اور فتنہ و فساد کے بانی تھے ؟

صعصعہؓ بن صوحان عبدی

صعصعہؓ بن صوحان عبدی بھی حضرت امیر المومنینؑ کے اصحاب میں خصوصی منزلت رکھتے تھے۔ یہ فصیح اللسان مقرر اور بڑے دیندار بزرگ تھے۔ شعبی کہا کرتے تھے کہ میں نے ان سے

خطبے سیکھے ہیں۔ تمام کتب رجال میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ یہ بڑے دیندار اور حضرت علیؑ کے جانثار صحابہ میں شمار ہوتے تھے۔ بایں ہمہ بعض نام نہاد مورخین اسلام نے ان پر بھی فتنہ انگیزی اور سبائیت کا الزام لگایا ہے۔ معین الدین احمد ندوی تاریخ اسلام میں عہد عثمان کے حالات لکھتے ہوئے ان کے متعلق فرماتے ہیں:۔

"کوفہ کے انقلاب پسندوں کے سرغنہ اشترؓ نخعی۔ جندب بن کعب۔ ابن ذی الحنکہ۔ صعصعہؓ۔ ابن الکواء کمیلؓ اور عمر بن صابی تھے۔ ان کا کام حضرت عثمان کو بدنام کرنا تھا۔ یہ لوگ ذرا ذرا سی بات پر فتنہ انگیزی کرتے تھے۔" (تاریخ اسلام جلد اوّل)

صعصعہؓ مذکور کا بھی اتنا ہی قصور ہے جتنا کہ ہم مالک اشترؓ کا بیان کر چکے ہیں۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ سیاست وقت سے ناشدنی امور کے صدور پر جتنا دوسرے لوگ آزادانہ رائے استعمال کرتے تھے یہ صعصعہؓ بھی حق بات کہنے سے دریغ نہ کرتے۔ مگر باوجود حکومت سے اتنے اختلافات کے کوئی روایت یہ نہیں بتاتی کہ انھوں نے کسی وقت کوئی ایسا قدم اٹھایا ہو جو فتنہ کا سبب ہو۔ اگر حکام کے خلاف کوئی آواز اٹھانا یا ان پر تنقید کرنا ہی فتنہ انگیزی ہے تو پھر ہر مصلح فتنہ انگیز کہا جانے کے قابل ہو سکتا ہے۔ یہی حیرت ہے کہ ایک طرف تو یہی مورخین اسلامی جمہوریت کے ثبوت میں انہی واقعات کو فخر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ دوسری طرف جب خلفاء اسلامیہ کی حمایت پر تُلتے ہیں تو ان کے مقرر کردہ فاسق و فاجر عمّال پر بھی تنقید گوارا نہیں کرتے۔ سعید ابن عاص ولید بن عقبہ۔ زیاد بن سمیہ۔ مروان یا حضرت عثمان کے دیگر متعین کردہ عمّال حکومت کا فسق و فجور اور بد طینتی تاریخ اسلام کے کس طالب علم سے پوشیدہ ہے۔ ان کے مقابلہ میں صعصعہؓ۔ حارثؓ اعور۔ عمرؓو ابن الحمق۔ اشترؓ۔ کمیلؓ اور حجرؓ بن عدی وغیرہ مقدس اصحاب علیؑ کو فتنہ انگیز بتانا۔ اور معروضہ داستانیں وضع کر کے ان پر سبائیت و یہودیت کا الزام

لگانا معلوم نہیں کس بنا پر ہے۔

صعصعہؓ اپنی قوم قبیلہ عبد القیس کے سرداروں میں سے تھے۔ ابن عبد البر نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ:۔

"صعصعہؓ نہایت فصیح۔ مقرر۔ عاقل و زیرک۔ زبان آور اور متدین فاضل اور بلیغ تھے۔ ان کا شمار اصحاب علی میں ہوتا ہے۔ یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ صعصعہؓ اور زید و صیحان پسران صوحان عبد القیس کے خطباء میں تھے۔" (استیعاب جلد ۱ ص ۵۴۲)۔

صعصعہؓ مذکور ائمہ رجال کے نزدیک ثقہ اور معروف تھے اور پیغمبر اسلام کے راویان حدیث میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ اور یہ حضرت عثمان۔ حضرت علیؑ اور ابن عباس وغیرہ سے روایت کرتے ہیں۔ ابن سعد کا قول ہے کہ:۔

"صعصعہؓ ثقہ مگر قلیل الحدیث تھے۔ ابن حبان نے بھی ان کا شمار ثقات میں کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ "وہ ثقہ اور معروف تھے۔ اور عبد اللہ بن بریدہ نے سنن ابی داؤد میں ان سے حدیث کی روایت کی ہے۔" (تہذیب التہذیب ابن حجر جلد ۳ ص ۴۲۲)

مختصر یہ کہ یہ مقدس بزرگ متدین۔ ثقہ۔ اور مختلف العلوم سے بہرۂ وافی حاصل کئے ہوئے تھے۔ اور حضرت ابن عباس باوجود اپنے تبحر علم کے ان کو "باقر علم العرب" کہا کرتے تھے (مروج الذہب مسعودی جلد ۲ ص ۶۴) لہذا ایسے شخص پر الزام لگانے والے اپنے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں اور تاریخ وحدیث پر بھی ان کی یہ انتہائی جسارت ہے۔ اور ائمہ رجال پر ان کا یہ افترا و بہتان ہے۔

عمروؓ ابن الحمق مدینہ میں جب حضرت عثمان کے خلاف انقلاب بپا ہوا تو ان مخالف گروہ میں آپ کا نام بھی تاریخوں میں ملتا ہے۔ ابن

عبدالبر لکھتے ہیں :۔

"عمرؓو ابن الحمق ان لوگوں میں سے تھے جو حضرت عثمان کی طرف بڑھے اور یہ ان چار آدمیوں میں سے تھے جو اُن کے گھر میں داخل ہوئے جیسا کہ مورخین کا بیان ہے۔ اس کے بعد وہ علیؑ کے شیعوں میں ہو گئے۔"

(استیعاب جلد ۲ صہ ۴۴۰)

ابن حجر نے اصابہ میں تحریر کیا ہے کہ :۔

"عمرؓو ابن الحمق حضرت عثمان کے مخالف گروہ میں ہو گئے۔ اور علیؑ کے ہمراہ ان کی تمام جنگوں میں حاضر رہے" (اصابہ جلد ۴ صہ ۲۹۴)

اس کے علاوہ طبری۔ کامل اور ابنِ خلدون نے بھی ایسا ہی لکھا ہے۔ عہدِ امیرالمومنینؑ میں عمرو مذکور حضرت علیؑ کے پُرجوش حامیوں میں سے تھے۔ جیسا کہ تمام مورخین نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ آپ کے ہمراہ تمام مشاہد جمل و صفین اور نہروان وغیرہ میں شریک رہے۔ چنانچہ جنگِ جمل کے موقعہ پر اتنی بہادری کے ساتھ جنگ کی کہ مخالفین کے دانت کھٹے ہو گئے۔

آپ کے صحابیِ رسولؐ ہونے پر تمام اربابِ سیر و رجال کا اتفاق ہے۔ علامہ حجر عسقلانی جو فنِ رجال کے امام ہو گزرے ہیں، ان کی صحابیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ابن سکن کا قول ہے کہ آپ کو صحابیتِ رسولؐ کا شرف حاصل ہے۔ ابو عمر و کہتے ہیں کہ آپ نے حدیبیہ کے بعد ہجرت کی۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ حجۃ الوداع کے بعد اسلام لائے۔ پہلی روایت زیادہ صحیح ہے" (اصابہ جلد ۴ صہ ۲۹۴)

اس کے بعد ابن حجر تحریر کرتے ہیں :۔

"عمرؓو ابن الحمق جنگِ بدر میں شریک تھے۔ اور آپ نے ایک

مرتبہ رسولؐ اللہ کی خدمت میں پینے کے لئے دودھ حاضر کیا تھا جس پر آپؐ نے یہ دعا دی تھی کہ "خداوند اس کو جوانی سے متمتع رکھ" چنانچہ اسی دعا کا اثر تھا کہ آپ اسّی سال زندہ رہے لیکن کوئی بال سفید نہیں ہوا۔"

(اصابہ جلد ۴ صـ ۲۹۴)

یہ مقدس بزرگ کافی عرصہ پیغمبرؐ اسلام کی صحبت میں رہے اور آنحضرتؐ سے احادیث کو بھی حفظ کیا۔ صاحبِ استیعاب کا بیان ہے:۔

"صحب النبی وحفظ عنہ احادیث" (آپ آنحضرتؐ کی صحبت میں رہے اور ان سے احادیث حفظ کیا۔)

(استیعاب جلد ۲ صـ ۴۰۴)

"حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے عمرو ابن الحمق کے متعلق بارگاہِ احدیت میں دعا کی تھی کہ اے خدا اس کے قلب کو تقویٰ سے نورانی کر اور سیدھے راستہ کی اس کی راہ نمائی فرما۔ کاش! اس کی مثل میرے لشکر میں سو آدمی ہی ہوتے۔" (شرح ابن ابی الحدید جلد ۱ صـ ۱۵۵)

"آپ نہایت عبادت گزار۔ تقویٰ و پرہیز گاری سے متصف صحابی رسولؐ تھے۔ امام حسین علیہ السلام نے اپنے ایک مکتوب میں جو انھوں نے معاویہ کو تحریر کیا تھا فرماتے ہیں۔ "اے معاویہ کیا تم عمروؓ ابن الحمق کے قاتل نہیں ہو۔ جو ایسے صالح بندوں میں سے تھے جن کے چہرہ کو کثرتِ عبادت نے بے رونق کر دیا اور گھُلا دیا تھا۔ تو نے ان کو وعدہ امن دینے کے بعد قتل کیا۔" (امامۃ والسیاستہ صـ ۱۶۸)

"یہ مقدس انسان ان لوگوں میں سے ہیں جو حجر بن عدی کے گروہ میں شامل تھے اور امیرِ شام نے فقط محبتِ علیؑ میں ان کو بے جرم و خطا

قتل کیا تھا۔" (طبری جلد ۶ ص ۳۵۶؛ البدایۃ النہایہ جلد ۸ ص ۵۵)

عمروؓ ابن الحمق کی سیاسی زندگی کے بارے میں تاریخ سے اتنا ہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ کے انتقال کے بعد آپ شام چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کر لی تھی البتہ حضرت عثمان کے زمانۂ خلافت میں کچھ نامعلوم اسباب کی بناء پر کوفہ آ گئے تھے اور یہیں سے ان کی سیاسی زندگی کی ابتدا ہوئی ہے۔ اور ارباب اقتدار کے نامناسب اقدامات پہ جرح و تنقید شروع کی، اور بعد میں ان کی سیاسی سرگرمیوں کی اتنی شدت ہوئی کہ قتل عثمان میں شریک ہو گئے۔

یہ سارے واقعات طبری، کامل اور ابن خلدون وغیرہ میں تفصیل سے پائے جاتے ہیں۔ مگر اس شدت اور مخالفت میں ان کا پارٹ اتنا ہی تھا جتنا کہ دوسرے مہاجرین و انصار اور باہر سے آنے والے مخالفین عثمان ادا کر رہے تھے۔ بایں ہمہ ان کا دامن خفیہ سازشوں، خلاف دیانت سکیموں اور سبائیت وغیرہ الزامات سے بالکل صاف نظر آتا ہے۔ اگر ان کے عقائد اور اخلاص نیت پر حضرت امیر المومنین اور حضرت امام حسین علیہما السلام کو شبہ ہوتا تو ہرگز ان کی حوصلہ افزائی اور مدح و ستائش نہ فرماتے۔ جیسا کہ ان کے تذکرہ میں ہم نے ان ہر دو بزرگوں کے مدحیہ کلمات کو درج کیا ہے۔

حجر بن عدیؓ اور ان کے ساتھی

حجر بن عدیؓ کا شمار ان اصحاب میں ہے جو اپنے علم و تقویٰ اور زہد و تقدس میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ ان کے صحابی ہونے پر تمام ارباب سیر و رجال کا اتفاق ہے۔ علامہ ابن اثیر جزری لکھتے ہیں:۔

"حجر بن عدیؓ اپنے بھائی ہانی بن عدی کے ہمراہ آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جنگ قادسیہ میں شریک تھے فضلائے صحابہ میں سے تھے۔" (اسد الغابہ جلد ۱ ص ۳۸۵)

"علامہ ابن کثیر نے ان کو محمد بن سعد کے حوالہ سے صحابہ کے طبقۂ رابعہ میں شمار کیا ہے۔ اور آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہونے کا تذکرہ کرتے ہوئے تابعین اہلِ کوفہ کے طبقۂ اوّل میں لکھا ہے"

(البدایۃ النہایہ جلد ۸ ص۵۰)

علامہ ابنِ عبد البر لکھتے ہیں :-

" احمد کا بیان ہے کہ میں نے یحییٰ بن سلمان سے کہا کہ کیا یہ بات آپ کو پہنچی ہے کہ حجرؓ مستجاب الدعوۃ تھے ؟ انھوں نے کہا کہ بے شک وہ افاضل اصحاب رسولؐ میں سے تھے "

(استیعاب جلد اول ص۱۳۴)

مرزبانی کا قول ہے کہ :-

" حجرؓ سب سے زیادہ عبادت گزار اور زاہد لوگوں میں سے تھے اور اپنی ماں کے ساتھ بہت نیکی کرنے والے تھے۔ نیز نماز روزے میں بہت زیادہ شغف رکھتے تھے۔ اور ہر حدث کے بعد وضو ضرور کرتے اور جب بھی وضو کرتے دو رکعت نماز بجالاتے "

(البدایۃ النہایہ جلد ۸ ص۵۰)

حجرؓ بن عدی تقدس۔ زہد اور تقویٰ و پرہیزگاری کے علاوہ رواۃ حدیث میں بھی اپنا مقام رکھتے ہیں۔ اور اپنے مسلک میں اتنے محتاط تھے کہ سوائے حضرت امیرالمومنینؑ کے انھوں نے کسی اور سے حدیث کو روایت کرنا مناسب ہی نہیں سمجھا مؤلف طبقات ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں :-

" کان ثقہ معروفاً ولم یروعن غیر علی شیئاً "

(حجرؓ بن عدی ثقہ اور معروف تھے اور بجز علیؑ کے انھوں نے کسی

دوسرے سے روایتِ حدیث نہیں کی ۔)

(البدایۃ النہایہ جلد ۸ صفحہ ۵۰)

یہ تھے وہ خیالات افاضل ائمہِ رجال کے جو انھوں نے اپنے اپنے مؤلفات میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کر کے حجرؓ بن عدی کی دینی اور روحانی عظمت کا اعتراف کیا ہے ۔ ان کے علاوہ اصحابِ عصمت علیہ السّلام کی نگاہ میں بھی وہ بلند مقام رکھتے تھے ۔ چنانچہ حضرت امام حسین علیہ السّلام نے حجرؓ بن عدی کے قتل کے بعد معاویہ بن ابو سفیان کو خط لکھا ۔ اس میں حجرؓ اور ان کے اصحاب کے بارے میں جو قبیح الفاظ لکھے ہیں ان سے اس مقدس صحابیِ رسولؐ کی عظمتِ حقیقی سامنے آجاتی ہے ۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں :۔

"اے معاویہ ! کیا تم حجرؓ بن عدی کندی اور ان کے عبادت گزار اور نمازی اصحاب کے قاتل نہیں ہو ؟ جو ظلم سے انکار کرتے تھے اور بدعتوں کے مخالف تھے اور منکرات سے روکتے تھے ۔"

(امامۃ والسیاسۃ صفحہ ۱۶۸)

حجرؓ بن عدی کا تذکرہ تاریخ میں عموماً ایک عابد و زاہد صحابیِ رسولؐ کی حیثیت سے کیا جاتا ہے ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ ان صفات کے علاوہ ایک جنگجو سپاہی اور فاتح کی حیثیت سے کسی سے کم نہیں ۔ حضرت عمر کے عہد میں جنگِ قادسیہ مدائن اور حلوان وغیرہ کے محاربات میں وہ برابر شریک رہے اور ان جنگوں میں نمایاں خدمات انجام دیں ۔ بلاذری نے حجرؓ کی ان خدمات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے :۔

"عائشہ بنت سعد بن ابی وقاص نے بیان کیا کہ جب معاویہ نے حجرؓ بن عدی کو قتل کیا تو میرے والد (سعد بن ابی وقاص) نے کہا اگر معاویہ نے دیکھا ہوتا کہ فتح حلوان میں حجرؓ کے کیا کارنامے تھے تو کسے

معلوم ہو جاتا کہ اسلام میں ان کی کیا منزلت ہے"۔

(فتوح البلدان بلاذری ص۳۰۲)

عہدِ امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب علیہ السّلام میں حجرؓ بن عدی کا آنحضرتؐ کے مخصوص صحابہ اور ممتاز جاں نثاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ جنگِ جمل و صفین اور نہروان میں یہ مقدس انسان برابر شریک رہا۔ اور جنگی خدمات کے سلسلہ میں نمایاں کام کئے۔ اسی طرح حضرت امیر المؤمنینؑ کی شہادت کے بعد وہ خانوادۂ رسالت کے برابر منسلک رہے اور جس طرح حضرت امیر المؤمنینؑ کی حمایت و نُصرت کرتے رہے اُسی طرح جناب امام حسنؑ کی نُصرت و حمایت میں سرگرمی سے حصّہ لیتے رہے۔

تمام اربابِ سیر و رجال کا اتفاق ہے کہ حجرؓ بن عدی حضرت امیر المؤمنینؑ کے مخصوص اصحاب اور ان کے مخلص شیعوں میں سے تھے۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ وہ خلفاءِ ثلاثہ اور اُن کے ہم خیال افراد سے ان کو مذہبی عقیدت نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی جہاں تک حضراتِ شیخین (ابوبکر و عمر) کا تعلق ہے ان کے بارے میں کوئی ایسی تصریح نہیں ملتی جس سے حجرؓ بن عدی کے خیالات کا اندازہ کیا جا سکے۔ البتہ حضرت عثمان اور معاویہ وغیرہ کے متعلق بکثرت روایات ایسی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حجرؓ بن عدی اُنکو حق پر نہیں سمجھتے تھے۔ علامہ ابنِ کثیر لکھتے ہیں:-

"ابن جریر نیز دیگر مورخین نے حجرؓ بن عدی اور ان کے اصحاب کے بارے میں بیان کیا ہے کہ یہ لوگ حضرت عثمان پر شدّت سے نکتہ چینی کرتے تھے۔ اور ان کو ظالم سمجھتے تھے۔ نیز امراء پر تنقید کرتے اور انکے احکام سے منکر تھے۔ اور اس بارے میں بہت مبالغہ کرتے تھے۔ اور شیعانِ علیؑ کو دوست رکھتے تھے اور دین میں بہت شدید تھے"۔

(البدایۃ والنہایۃ جلد ۸ ص۵۴) (بحوالہ اصحابِ امیر المؤمنین نمبر "سرفراز" لکھنؤ)

عہدِ عثمان کے پُرفتن حالات اور سیاسی انقلاب میں حجر اور اُن کے اصحاب کا بھی سیاسی مسلک وہی تھا جو دوسرے اکابرینِ ملّت اور اصحابِ امیرالمؤمنینؑ رکھتے تھے مگر یہ تنقیدیں اور اعتراضات اس حد تک محدود تھے جس حد تک کہ عام سربرآوردہ مہذب شہریوں سے کسی حکومت کے خلاف ہو سکتے ہوں۔ ان کا یہی قصور تھا کہ حق بات کہتے تھے اور عمّالِ حکومت کو خدا اور رسولؐ کا خوف دلا کر بدعات و منکرات سے منع کرتے تھے۔ ان باتوں کے علاوہ سب سے زیادہ الزام جو ان بزرگواروں پر اس وقت عائد کیا گیا وہ فقط یہ تھا کہ یہ لوگ حضرت امیرالمؤمنینؑ کے دست و بازو اور آنحضرتؐ سے مخلصانہ عقیدت رکھتے تھے۔ مالک اشترؓ۔ صعصعہؓ۔ عمرو ابن الحمقؓ۔ عمار یاسرؓ اور ابوذر غفاریؓ کی طرح انھیں بھی بعض مورخین نے فتنہ انگیز اور فتنہ و فساد کا بانی قرار دیا ہے۔ اور عبداللہ بن سبا کی پارٹی کے ممتاز افراد سے شمار کیا ہے۔ مؤرخ طبری نے جہاں ابن سبا کا فرضی قصّہ درج کر کے غلط سلط روایات کو ایسے بزرگوں کے سر تھوپا ہے، وہاں ایک روایت یہ بھی لکھدی کہ:-

"جب زیاد بن ابوسفیان نے حجر اور ان کے ساتھیوں کو معاویہ کے پاس گرفتار کر کے بھیجا تو خط میں حجر بن عدی اور ان کے بارہ اصحاب کو "سبائیہ ترابیہ" کے خطاب سے یاد کیا" (طبری جلد ۶ صہ ۱۵۲)

یہ روایت بھی ان لوگوں کے خیالات کی مؤید معلوم ہوتی ہے جنھوں نے ابن سبا اور سبائین کے معاملہ کو طول دیا ہے۔ جس طرح ابن سبا کا سارا افسانہ عقل و درایت کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترتا اسی طرح یہ روایت بھی اس قابل نہیں کہ سبائیت کی ابتدا معاویہ کے عہد سے تسلیم کی جائے۔ کیونکہ یہ افسانہ تو سیف ابن عمر راوی کا ہے جو ۱۷۰ھ میں فوت ہوا۔ اور صرف طبری نے ہی ان واقعات کو سیف سے روایت کیا۔ حالانکہ طبری سے پہلے کی تمام تاریخیں اس معاملہ میں خاموش ہیں جیسا کہ سابقاً ہم تفصیل سے اس موضوع

پر گفتگو کر چکے ہیں۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو یہ تو اپنے مقام پر ثابت ہے کہ حجر اور ان کے اصحاب فتنہ و فساد وغیرہ کے الزامات سے بالکل بری ہیں حضرت عثمان کی مخالفت اور ان پر شدت تنقید کی سزا اگرچہ اس وقت تو کسی وجہ سے انھیں نہ مل سکی مگر بعد میں جب امیر معاویہ ساری اسلامی مملکت پر مسلط ہوا تو اس نے حضرت امیرالمومنین ؑ کی شہادت کے بعد حجر اور ان کے پاکباز ساتھیوں کو فقط اسی جرم میں تلوار کے گھاٹ اتار دیا (طبری جلد ۵ ص ۱۵۲)۔

حجرؓ اور ان کے ساتھیوں کے سفاکانہ قتل اور شہادت کا تفصیلی واقعہ ہم پیش نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ یہ واقعہ ایک تو معاویہ کے عہد کا ہے اور ہمارا موضوع خلافت عثمانیہ کے حالات پر تبصرہ کرنا ہے۔ اور دوسرے یہ تفصیل ایک مستقل باب چاہتی ہے جسے ہم طوالت کے اندیشہ سے نظر انداز کرتے ہیں۔

بہرحال حجرؓ بن عدی کا واقعہ قتل ایسا غیر اہم نہ تھا جس سے اس وقت کی اسلامی دنیا متاثر نہ ہوتی۔ حجر بن عدی ایسی شخصیت نہ تھی جس کے قتل کو مسلمان آسانی سے برداشت کر لیتے۔ اور مذہبی حلقوں کی طرف سے کوئی صدائے احتجاج بلند نہ ہوتی۔ وہ ایک عابد زاہد بزرگ ہونے کے علاوہ صحابی رسولؐ بھی تھے۔ جس کی بنا پر لوگ انھیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ مؤلف سیر الصحابہ لکھتے ہیں:۔

"حجرؓ کا قتل معمولی واقعہ نہ تھا، اپنے خاندانی اعزاز اور حضرت علیؑ کی حمایت کی وجہ سے کوفہ میں وہ بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اس لئے اہلِ کوفہ میں بڑی برہمی پیدا ہوئی۔ معززین کوفہ حضرت حسینؑ کے پاس فریاد لے کر پہنچے۔ آپ بے حد متاثر ہوئے۔"

(سیر الصحابہ جلد ۷ ص ۴۹)

اس کے بعد مؤلفِ مذکور حجرؓ کے قتل پر ام المومنین کے تاثرات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اہلِ بیتِ نبوی میں حجر کی بڑی وقعت تھی۔ چنانچہ حضرت عائشہ نے جس وقت ان کی گرفتاری کی خبر سُنی تو اُسی وقت انھوں نے عبدالرحمان بن حارث کو معاویہ کے پاس دوڑادیا کہ وہ حجر[۴] اور ان کے رفقاء کے بارے میں خدا کا خوف کریں۔ لیکن یہ اُس وقت پہنچے جب حجر قتل ہو چکے تھے۔"

(سیر الصحابہ جلد ۷ صـ ۴۹)

"ام المومنین کے علاوہ عبداللہ بن عمر بھی بے حد متأثر ہوئے چنانچہ جس وقت انھیں حجر کے قتل کی خبر پہنچی تو وہ اس وقت بازار میں تھے خبر سنتے ہی بے چین ہو گئے اور چیخیں مار مار کر رونے لگے۔"

(اسد الغابہ جلد ۱ صـ ۳۸۶)

"صحابہ کے بعد تابعین میں حسن بصری کا مرتبہ بہت بلند ہے جب ان کے سامنے حجر کے قتل کا ذکر ہوا تو انھوں نے کہا کہ وائے ہو اُس پر جس نے حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کیا۔"

(استیعاب۔ جلد ۱ صـ ۱۳۵)

ام المومنین حضرت عائشہ۔ عبداللہ بن عمر اور حسن بصری وغیرہ مقتدر اکابرینِ اسلام[۴] کا حجر کے قتل پر معاویہ کو ملامت کرنا اور خود بے حد متأثر ہونا دلیل ہے اس بات کی کہ حجر[۴۱] اور ان کے ساتھی فتنہ باز اور فساد انگیز نہ تھے بلکہ اس وقت کی اسلامی سوسائٹی میں اعلیٰ سیرت اور بلند کردار رکھتے تھے۔

محمدؐ بن ابوبکر[۴] ان کی والدہ ماجدہ اسماء بنت عمیس ہیں۔ جو اوّل اوّل جعفر بن ابیطالب کی زوجہ تھیں۔ صاحبِ استیعاب فرماتے ہیں کہ "حضرت امیر علیہ السلام محمد کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کی تعریفیں فرمایا کرتے اور اقران پر فضیلت دیتے تھے، اس لئے کہ وہ عابد و مجتہد تھے۔ حضرت امیر علیہ السّلام کے ساتھ جنگِ جمل و صفین

میں برابر شریک رہے۔ اور منجملہ اُس گروہ کے ساتھ تھے جنھوں نے عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا اور بعض کا خیال ہے کہ اُن کے خون میں بھی شرکت کی تھی۔ مگر بعض کا خیال ہے کہ وہ قتل میں شریک نہیں تھے۔ لیکن تاریخ اعثم کوفی سے اس امر کی تائید ہوتی ہے کہ وہ قتلِ عثمان میں پیش پیش تھے۔ عہدِ امیر المومنینؑ میں جب یہ والیِ مصر تھے تو معاویہ نے انھیں شہید کروا ڈالا۔ جب امیر المومنینؑ کو شہادت کی خبر پہنچی تو آپ نے گریہ کیا اور فرمایا کہ "وہ اللہ کا بندۂ صالح اور ہمارا فرزندِ صالح تھا۔"

یہ عجیب بات ہے کہ محمدؒ بن ابوبکر کو تو حضرت امیر علیہ السّلام کے فرزند اور اُن کا خالص محب ہونے کی وجہ سے خال المومنین نہیں کہا جاتا حالانکہ وہ حضرت عائشہؓ کے بھائی تھے۔ مگر امیر معاویہ کو خال المومنین کہا جاتا ہے۔ حضرت عثمان کی خلافت کے عہد میں ان کی سیاسی سرگرمیاں بھی تاریخ میں پائی جاتی ہیں جس طرح دوسرے افرادِ امت نے مظالمِ حکومت کو ناپسند کیا، اسی طرح اس نوجوان نے بھی اپنا سیاسی مسلک وہی رکھا۔ حضرت عائشہ کا بھائی اور خلیفۂ اوّل کا فرزند ہونے کی حیثیت سے انھیں توقع تھی کہ ہمارے ساتھ حکومتِ وقت کا اچھا سلوک ہو گا۔ اور اپنے خاندانی اعزاز کی بناء پر اُن کا یہ حق بھی تھا کہ وہ دوسرے اکثر نوجوان امویوں کی بجائے اسلامی نظامِ حکومت میں زیادہ حصّہ لیں۔ مگر باوجود اس کے کہ ان کے ساتھ کوئی نیک برتاؤ کیا جاتا الٹا مرکزی دارالخلافہ مدینہ سے ہی اُن کے قتل کی سازش ہو گئی جس پر یہ زیادہ برافروختہ ہو گئے اور مخالفتِ عثمان میں نہایت شدت اختیار کر لی۔

ڈاکٹر طہٰ حسین مصری ان کے خاندانی اعزاز اور حقوق پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس کی بزرگی و شرافت کے لئے اتنا کافی ہے کہ وہ صدیق اکبر کا فرزند اور ام المومنین حضرت عائشہ کا بھائی تھا۔ اور ان سب

باتوں کے علاوہ وہ قریشی نوجوان تھا، اور اُس عزت کا مالک تھا جو قریش کو حاصل تھی۔ اُسے اپنے والد بزرگوار کی منزلت پر ناز تھا۔ کیونکہ انھیں نبی صلی اللہ علیہ آلہ وسلم تمام مردوں سے زیادہ چاہتے تھے۔ اپنی ہمشیرہ پر بھی فخر تھا کہ وہ آنحضور کو جملہ خواتین سے زیادہ عزیز تھیں۔ بے شک اسے توقع تھی کہ حضرت عثمان اس کے رتبہ کا خیال کریں گے اور اُسکے والد اور ہمشیرہ مکرمہ کی عظمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسے ہی اسے بھی کہیں کی حکومت دیدیں گے جیسے وہ اپنے قرابتداروں کو دے رہے تھے، جو کسی انفرادی شخصیت یا کارکردگی کے لحاظ سے اس سے فائق نہ تھے۔ لیکن حضرت عثمان نے اس طرف کوئی توجہ نہ دی نہ اُسے کسی گنتی میں شمار کیا۔ حضرت عثمان کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ تمام قریشی نوجوانوں کو یا قریشی نوجوانوں کی اکثریت کو والی بنادیں۔ اسامیاں محدود تھیں، طلبگاروں کی کثرت تھی۔ البتہ حضرت عثمان نے ایک فریق کو دوسرے فریق پر ترجیح دے کر ان نوجوانوں کے دلوں میں مختلف قسم کے غم و غصہ اور غیرت و حسد کے جذبات کو برانگیختہ کر دیا۔"

(الفتنۃ الکبریٰ جلد اول صفحہ ۲۷۴)

محمد بن ابی حذیفہ

محمد بن ابی حذیفہ کی صحابیت روز روشن کی طرح واضح ہے ان کے متعلق ابن حجر اصابہ میں لکھتے ہیں:۔

"محمد بن ابی حذیفہ حبشہ میں پیدا ہوئے اور ان کے باپ ابو حذیفہ سابقین اولین میں سے تھے۔ ان کا نام محمد ہے اور ان کا شمار صحابہ میں ہے ان کے باپ ابو حذیفہ شام کی جنگ میں شہید ہو گئے تو عثمان نے محمد بن ابی حذیفہ کو پالا اور پرورش کی۔ جب محمد بن تمیز کو پہنچے تو سب سے زیادہ جو

شخص عثمان کے خلاف لوگوں کو جمع کرتا تھا وہ ہی تھے۔ انھوں نے عثمان کے معزول کرنے کی تحریک کی اور شہروں میں عثمان کے خلاف آگ بھڑکائی۔ لوگوں کو ابھارا۔ ازواج نبیؐ کی طرف سے خطوط لکھے جن میں عثمان پر طعن ہوا کرتی تھی۔ لوگوں کے مجمع میں یہ خطوط پڑھے جاتے تھے۔ ان میں یہ لکھا ہوتا تھا کہ اے اہلِ اسلام! عثمان نے شریعت میں ایسے ایسے تغیرات کئے جنکی ہم تم سے شکایت کرتے ہیں۔ لوگ ان خطوں کو سُن کر چیخ چیخ کر روتے تھے اور مسجدوں میں آوازِ گریہ بلند ہوتی تھی۔ محمدؐ نے ہی وہ لشکر مصر سے بھیجا تھا جس نے عثمان کا محاصرہ کیا اور ان کو قتل کر ڈالا۔" (اصابہ جلد ۳ صفحہ ۴۷۳)

علامہ ابو عمرو استیعاب میں یہ لکھتے ہیں:۔

"کہا جاتا ہے کہ عثمان کے شدید ترین مخالفین محمد نام کے تین بزرگ تھے۔ محمد بن ابو بکر۔ محمد بن ابی حذیفہ۔ محمد بن عمر ابن حزم۔"

(استیعاب تذکرہ محمد ابن عمرو ابن حزم)

محمدؐ بن ابی حذیفہ بمشکل چودہ پندرہ برس کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ باپ کی وفات کے بعد حضرت عثمان نے اُسے پالا اور عالمِ شباب تک حضرت عثمان کے پاس ہی رہا۔ حضرت عثمان جب تختِ خلافت پر متمکن ہوئے تو انھیں بھی اپنے باپ کی منزلت اور خود خلیفۂ وقت سے خصوصی تعلق رکھنے کی بنا پر یہ توقع تھی کہ حضرت عثمان دوسرے قریشی نوجوانوں خصوصاً بنی اُمیہ کی طرح اسے بھی جلد ہی کسی چھوٹے بڑے عہدے پر لگا دینگے مگر حضرت عثمان نے اپنے سیاسی تدبّر سے فائدہ نہ اٹھایا اور اس نوجوان کی خواہشات کو ٹھکرا دیا۔ اور یہ ناراض ہو کر مصر چلا گیا اور اسی وقت سے حضرت عثمان کا شدید مخالف بن گیا۔ مگر تاریخ سے یہ ثبوت نہیں ملتا کہ یہ بزرگوار اور محمدؐ بن ابی بکر وغیرہ عبداللہ بن سبا اور اس کے گروہ کی سازش کا شکار ہو گئے تھے۔ جو کچھ انھوں نے کیا وہ ان کا اپنا

ذاتی مؤقف اور سیاسی مسلک تھا۔

مالک اشترؓ۔ عمار یاسرؓ۔ صعصعہؓ بن صوحان۔ عمروؓ ابن الحمق۔ حجرؓ اور اس کے اصحاب۔ محمدؓ بن ابوبکر اور محمدؓ ابن ابو حذیفہ وغیرہ اصحاب رسولؐ و اصحاب امیر المؤمنینؑ کے سیرت و کردار ان کی دینی منزلت اور عالی مرتبت ہونے، نیز اُن کے سیاسی مؤقف و مسلک کو ہم نے کتب سیر و تواریخ اور ائمہ رجال کے متفقہ بیانات سے واضح کر دیا ہے کہ یہ پاکباز انسان مخالفینِ حضرت عثمان اور متابعینِ امیر المؤمنینؑ ضرور تھے مگر اُن پر فتنہ انگیزی۔ فسق و فجور اور سبائیت وغیرہ کا الزام تاریخی بد دیانتی ہے۔ نیز اس کے ساتھ ساتھ "الصحابہ کلہم عدول" کا معیار عقیدت جو جمہور اسلام کی طرف سے بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے وہ ختم ہوتا نظر آتا ہے۔ کیونکہ جس طرح حضرت عثمان وغیرہ صحابہ کی فہرست میں شامل تھے اسی طرح یہ بزرگوار بھی معتدد صحابہ میں سے شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ زید بن صوحان۔ کمیل اور جندب بن کعب وغیرہ کافی ایسے لوگ تھے جو اُن کے ساتھ شریک تھے۔ اگر ان لوگوں نے حکومت پر نکتہ چینیاں کیں تو کونسا جرم کیا؟ بلکہ یہ تو عین آزادیِ فکر اور مصلحانہ کارروائی ہے۔ ایک حکومت جو اسلامی حکومت ہونے کی مدعی ہو اور جس کی بنیاد مسلمانوں کی اکثریت کے پیشِ نظر جمہوری اصولوں پر استوار ہو تو اس کو دیکھتے ہوئے عوام کے ہر فرد کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خلافِ کتاب و سنت اُمور پر اپنے حکام کو متنبہ کرے۔ آج غیر مذہبی حکومتوں کے دَور میں بھی ہر شخص کو آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ معمولی سے معمولی آدمی بھی حکومت پر سخت سے سخت تنقید کرتا ہے۔ اور حکومت فراخدلی سے اس کو برداشت کرتی ہے اور کوئی قانونی دفعہ عائد نہیں کیجاتی ہے۔ اور اس سلسلہ میں خود خلافتِ ثانیہ میں بکثرت ایسے واقعات ملتے ہیں جن میں خلیفۂ وقت حضرت عمر پر کھُلے بندوں تنقید ہوتی تھی اور خود حضرت عمر اس بات کا اعتراف کرتے تھے کہ تمام لوگ عمر سے زیادہ فقہ جانتے ہیں، یہاں تک کہ بوڑھی عورتیں بھی۔

اگر مذکورۂ بالا مقدس افرادِ امت پر فتنہ و فساد۔ شر انگیزی اور سبائی انجمن کا الزام اس واسطے لگایا جاتا ہے کہ سیاستِ وقت کی انھوں نے مخالفت کی۔ اور مخالفت کرنے کے بعد جب خلیفۂ وقت قتل ہو گئے تو حسبِ دلخواہ ایک نئے خلیفہ کا انتخاب کر لیا۔ تو یہ جرم تو سب سے زیادہ امہات المؤمنین اور اکابر مہاجرین و انصار کا ہے جنھوں نے بالواسطہ یا بلاواسطہ حضرت عثمان کے خلاف لوگوں کو اُکسایا اور بعد میں قتل بھی کروا دیا، اور حضرت امیر علیہ السّلام کے ہاتھ پر بخوشی بیعت بھی کر لی۔ جیسے طلحہ و زبیر وغیرہ۔ مگر اس ضمن میں جب ہم مورخین و معترضین کے بیانات کو بغور پڑھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ امہات المؤمنین اور طلحہ و زبیر وغیرہ اصحابِ رسولؐ کو سبائیت وغیرہ کے الزام سے بری دکھایا گیا ہے۔ ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ یہ دو رُخی پالیسی اور متضاد بیانی کیسی ہے جب تمام صحابۂ رسولؐ قتل عثمان کے ناگوار حادثہ میں شریک ہیں، اور اس قتل کی تمام تر ذمہ داری ابن سبا اور اس کی سازش پر ہی مبنی ہے تو چاہیئے یہ تھا کہ تمام صحابۂ رسولؐ اور اکابرینِ ملتِ اسلامیہ کو سبائی اور فتنہ انگیز کہا جاتا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ شدّتِ تعصّب نے طلحہ و زبیر اور امہات المؤمنین کو تو مجتہد بنا دیا اور حضرت امیر المؤمنینؑ کے مخلص صحابۂ ناصرین کو سبائیت کے خطاب سے نوازا۔

ہم تو اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ابنِ سبا اور اُس کے متعلق سب افسانے بالکل فرضی اور من گھڑت ہیں۔ ان ناخوشگوار واقعات کے علل و اسباب جیسا کہ ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں کچھ قدیم عداوتیں۔ مزید برآں حکومتِ وقت کی بے اعتدالیاں اور پھر بعض اکابرینِ ملت کی حصولِ اقتدار کی توقعات تھیں۔ اس زمانہ کے سیاسی مزاج اور لوگوں کے طبائعِ مختلفہ کے میلانات ہی اس بات کے مقتضی تھے کہ یہ فتنے رُونما ہوئے۔ ورنہ یہ کس قدر بعید از عقل بات ہے کہ ایک نومسلم یہودی آنِ واحد میں اصحابِ رسولؐ کو مجتمع کر کے تشتّت و افتراق کے دروازے کھول دے جن کا سلسلہ قیامت تک لاتناہی ہو

محاربۂ جمل اور اس کا پس منظر

ابن سبا اور سبائیین کے متعلق مبالغہ اور مغالطہ انگیزی سے کام لینے والے مورخین اور متکلمین نے ابن سبا کو اس کے مقام سے بہت بلند دکھانے اور اس کو اپنے مشن میں کامیاب ظاہر کرنے کی غرض سے اکابرینِ ملتِ اسلام طلحہ و زبیر و ام المومنین حضرت عائشہ اور امیر المومنین حضرت علی ابنِ ابی طالب علیہ السلام ایسے مدبرینِ امت پر بھی تہمت تراشی سے دریغ نہیں کیا۔ ان مورخین کا دعم ہے کہ جب قتلِ عثمان میں سبائی گروہ کامیاب ہو چکا تو انھوں نے اس خوف سے کہ کہیں خونِ عثمان میں بطور قصاص ہم ماخوذ نہ کر لئے جائیں اس واسطے انھوں نے ایک اور سازش کا جال بچھانے کی کوشش کی، اور صحابۂ کرام کو دوبارہ میدان جنگ میں لانے کی کوشش شروع کر دی۔

ان فرضی داستان سراؤں کا خیال ہے کہ جنگِ جمل کے فریقین پہلے سے بالکل ایک دوسرے کے ساتھ صاف تھے اور جنگ کرنے کا انھیں کوئی خیال نہ تھا یہی سبائیین دونوں فریق کو بصرہ کے محاذِ جنگ پر لانے میں کامیاب ہو گئے، اور آخر میں جب صلح کی پوری پوری امید ہو چکی تھی وہ اس وجہ سے نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی کہ سبائیوں کا گروہ اپنی خفیہ سکیم کے ذریعہ دونوں لشکروں کو آمنے سامنے کر دینے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اور اس وجہ سے فریقین کی صلح جنگ میں تبدیل ہو گئی۔

میرے خیال میں ان نام نہاد رواۃ و مورخین نے مورخانہ رواداری سے ہٹ کر ایسے واقعات لکھے ہیں اور مہاجرین و انصار پر انتہائی زیادتی سے کام لیا ہے۔ ام المومنین حضرت علیؑ و طلحہ و زبیر وغیرہ اصحابِ رسولؐ ان باتوں سے بہت بلند تھے۔ ان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ ایک چند دنوں کے نومسلم یہودی نژاد منافق کے جھانسے میں آ گئے اور ہزارہا مسلمانوں کا ناحق خون چند اوباشوں اور کمینوں کی خفیہ تدبیروں سے ضائع

کرادیں اور وہ اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے ایسی باتوں کو سمجھ نہ سکیں۔

ذیل میں ہم جنگِ جمل کے حقیقی علل و اسباب کا اجمالی خاکہ پیش کر کے یہ بات اچھی طرح واضح کر دیتے ہیں کہ قتلِ عثمان کے بعد جنگِ بصرہ خود مسلمانوں ہی کے ذہنی تخالف اور مذہبی و سیاسی تضاد کا نتیجہ تھی۔ ابنِ سبا اور سبائین کے افسانے تو اہی واقعات کو چھپانے کے لیئے وضع کیئے گئے ہیں۔

ہر ہنگامہ و فتنہ و فساد کے بانی مبانی اور سر برآوردہ کچھ خاص لوگ ہوتے ہیں اور ان فسادات میں اُن لیڈروں کی کچھ نہ کچھ توقعات پوشیدہ ہوتی ہیں جن کا وہ اظہار نہیں کرتے۔ اس ذیل میں وہ عوام الناس کو دھوکہ دینے کے لیئے وہ کسی ایسی بات کا اعلان کرتے ہیں جس سے کہ عقلِ عمومی اور انتشار پسند ذہن متاثر ہو سکیں۔ اور عوام کے غیظ و غضب سے فائدہ اٹھا کر وہ ان ہنگاموں کی تخم ریزی کرتے ہیں۔ وہ فتنہ و فساد جس کی ابتدا امیر المومنینؑ کے تخت نشین ہوتے ہی شروع کر دی گئی تھی اس کے سر برآوردہ اشخاص کے نام اس وقت کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ان میں معاویہ بن ابوسفیان طلحہ و زبیر اور ام المومنین حضرت عائشہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ معاویہ بن ابوسفیان جو بنو امیہ کا چشم و چراغ اور اموی ڈپلومیسی کا ترجمان تھا اور طلحہ و زبیر جو اکابر صحابہ اور جمہور مسلمین کے خیال کے مطابق عشرہ مبشرہ میں داخل تھے، اور ام المومنین حضرت عائشہ جو پیغمبر اسلام کی زوجہ محترمہ تھیں نے ملا کر سوچی سمجھی سکیم کے ماتحت جنگِ جمل ایسے فتنہ کبریٰ کی بنیاد رکھی اور لوگوں کو اس جنگ میں شرکت کرنے کی خاص طور پر دعوت دی۔ خلیفۂ وقت حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے ان حضرات کی مخالفت کی ظاہری وجہ قتلِ عثمان کے قصاص کا مطالبہ تھا جس کے متعلق خود حضرت امیر علیہ السلام نے ایک بار نہیں کئی دفعہ اعلان کیا کہ میں خونِ عثمان سے بری ہوں۔ چنانچہ نہج البلاغہ کے خطبات و مکتوبات اس امر پر شاہد ہیں۔

مگر اس مخالفت کے حقیقی اسباب کچھ اور تھے۔ وہ یہ کہ امیر شام معاویہ بن ابو سفیان مدت سے خلافت کی خوابیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ بنو ہاشم اور بنو امیہ کی قدیمی دشمنی کے جذبات اور امویوں کے جاہلی تعصبات بعد از اسلام بھی اسی طرح کارفرما تھے جس طرح کہ قبل از اسلام۔ اموی نوجوانوں کی پشت پناہی اور وسیع وعریض صوبہ شام کا اقتدار اس اموی ڈکٹیٹر کے ارادوں کو پروان چڑھانے کے سلسلہ میں ممد و معاون اور سازگار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ساری حکومتِ اسلامیہ کو ہتھیانے کے لئے کسی موقعہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ محاصرہ کے دنوں میں حضرت عثمان نے بارہا طلبِ نصرت کی مگر باوجود اموی نژاد ہونے کے اپنے حقیقی ارادوں کی تکمیل کی غرض سے شام میں بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہا مگر ٹس سے مس نہ ہوا جس کی وجہ یہی کہی جاسکتی ہے کہ اُسے عثمان کا قتل ہو جانا اسی لئے گوارا تھا کہ اس کے بعد اموی سیاست کے زور سے مرکز پر بھی قابو ہو جائے گا۔ انہی خیالات نے اُسے حضرت امیر المومنینؑ کی اطاعت سے باز رکھا اور جنگِ صفین کے موقعہ پر وہ تحکیم کی کامیاب سازش کی بدولت اپنے ارادوں میں کامیاب ہو کر ہی رہا۔

جب حضرت عثمان قتل ہو گئے تو حالات کے اعتبار سے چاہیئے تو یہ تھا کہ معاویہ بن ابو سفیان سب سے پہلے امیر المومنینؑ کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا، مگر اس کی اموی ڈپلومیسی نے اس کو آڑے ہاتھوں لیا اور حضرت علیؑ کے دوسرے مخالفین کو میدانِ جنگ میں جھونک دیا۔ حالانکہ وہ بیعت بھی کر چکے تھے۔ طلحہ و زبیر وغیرہ کے ساتھ سازباز شروع کر دی اور اُنھیں اس بات کا یقین دلایا کہ کامیابی کے بعد خلافت کا تاج آپ کے سروں پر ہوگا اور میں آپ کی اطاعت کرلونگا۔ نیز عسکری طاقت اور جنگ کے اخراجات وغیرہ سے بھی مدد کرونگا۔ اس لئے آپ عَلمِ بغاوت بلند کردیں اور خونِ عثمان کے قصاص کو بہانہ قرار دیں۔

چونکہ طلحہ و زبیر کے دل میں خلافت کی طمع تو مجلس شوریٰ کے وقت سے ہی تھی اور اسی وجہ سے وہ قتلِ عثمان میں پیش پیش رہے تھے اس لئے امیرِ شام کی دعوت پر فوراً لبیک کہدی۔ حضرت امیر المومنینؑ کے خلیفہ ہو جانے پر اُن کی تمام اُمیدیں خاک میں مل گئی تھیں، اور وہ کچھ نہ کر سکتے تھے۔ خواہ مخواہ امیر المومنینؑ کو تنگ کرنے کے لئے کوفہ و بصرہ کی گورنریاں طلب کیں اس خیال سے کہ اگر یہ دو صوبے ہاتھ آگئے تو اقتدار کے زور سے مرکز پر قابو پانا آسان ہو جائے گا۔ مگر قائدِ ملتِ اسلامیہ نے اپنی دینی و سیاسی بصیرت پر بھانپ لیا اور صاف انکار کر دیا۔

یہی وجہ ہے کہ یہ دونوں حضرات معاویہ بن ابو سفیان کے جھانسے میں آگئے اور بغاوت کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ ان حالات پر عہدِ حاضر کا نکتہ سنج مورّخ عبدالرزاق ملیح آبادی یوں تبصرہ کرتا نظر آتا ہے :۔

"بیعت کے بعد طلحہ و زبیر نے کوفہ و بصرہ کی گورنریاں طلب کیں لیکن حضرت نے انکار کر دیا، تو مکہ جانے کی اجازت چاہی۔ حضرت اُنکے ارادوں سے واقف تھے، مگر آزادی میں خلل ڈالنا نہیں چاہتے تھے اجازت دیدی۔ دراصل دونوں کے پاس معاویہ کے خط پہنچ چکے تھے کہ عثمان کے خون کا دعویٰ کیا جائے اور حضرت علیؑ کو خلافت سے بیدخل کر دیا جائے اور یہ دونوں باری باری خلیفہ بنیں۔ معاویہ نے یہ یقین دلایا تھا کہ ان کی بیعت کرلیں گے اور ہر قسم کی مدد دیں گے۔ یہ بھی معاویہ کا مشورہ تھا کہ مکہ جائیں جہاں یمن کا عثمانی گورنر ملیگا وہ مالی مدد پیش کریگا حضرت عائشہ پہلے سے مکہ میں موجود تھیں اور حضرت علیؑ سے اُن کا رنج بہت پُرانا تھا۔ معاویہ نے لکھا کہ اُنھیں بھی بلا لیا جائے۔ بنو امیہ کے اور لوگ بھی مکہ میں ہیں، وہ بھی ساتھ دیں گے۔ پھر سب ملکر عراق جائیں اور اُس پر

قبضہ کرلیں کہ بہت بڑا طاقتور مرکز ہے۔

معاویہ چاہتا تھا کہ طلحہ و زبیر امیر المومنینؑ سے ٹکرا جائیں۔ فریقین میں ایک ختم ہو جائے گا اور جسے فتح ہو گی وہ بھی کمزور پڑ جائے گا اور معاویہ کو اپنی سلطنت قائم کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔"

(نہج البلاغہ۔ مترجم مطبوعہ لاہور۔ طبع دوم ص۷۰۲)

طلحہ و زبیر کی وجہ مخالفت

طلحہ و زبیر کی مخالفت امیر المومنینؑ سے کوئی زیادہ تعجب خیز نہیں۔ ہم پہلے تحریر کر چکے ہیں کہ شوریٰ کے دن سے ہی ان کے دلوں میں خلافت کی امیدیں پرورش پا رہی تھیں۔ انہی امیدوں نے ان کو قتلِ عثمان پر آمادہ کیا اور یہی توقعات ان کو کشاں کشاں جمل کے میدان میں لائیں۔ مزید برآں امیر المومنینؑ کا اُن کے مطالبات کو ٹھکرا دینا اور اس پر معاویہ کا انھیں وعدۂ نصرت دینا ان کے بغاوت کرنے کا زیادہ سبب بنا، اور اس کے بعد اُمّ المومنین حضرت عائشہ کی معیت سونے پر سہاگے کا کام دے گئی۔ طلحہ چونکہ ابوبکر کے خاندان سے تھے اس لئے وہ تو سقیفہ کے روز سے ہی اہلِ بیتِ نبوی کے مسلک سے مخالف رکھتے تھے اور حضرت ابوبکر کے خلیفہ ہونے سے وہ خلافت کو اپنے خاندان کا مستقل حق خیال کرتے تھے۔ انھیں پورا یقین تھا کہ ابوبکر کے بعد وہ خلیفہ ہو جائیں گے۔ اس بات کا اظہار بھی انھوں نے اشارتاً کر دیا تھا۔ چنانچہ مورخین کا بیان ہے کہ جب ابوبکر نے عمر کو خلیفہ نامزد کیا تو طلحہ نے غصہ میں ہو کر کہا کہ آپ عمر کو خلیفہ بنا رہے ہیں حالانکہ دوسرے لوگ اُن سے زیادہ اہل موجود ہیں۔ رہ گئے زبیر تو وہ ابتداً تو بنو ہاشم کے ساتھ رہے اور اس سلسلہ میں تکالیف بھی برداشت کیں۔ مورخین بیان کرتے ہیں کہ ابوبکر کی خلافت کی بیعت کے سلسلہ میں انھوں نے شدت اختیار کر لی تھی اور انکار پر ڈٹے رہے، یہاں تک کہ حکومتِ وقت کے خلاف تلوار بھی میان سے نکال لی تھی۔ مگر جب

ان کے فرزند عبداللہ بڑے ہوئے تو انھوں نے ان کو سابقہ مسلک سے ہٹا دیا۔ اسی لیے امیر المومنینؑ فرمایا کرتے "مازال الزبیر منّا حتٰی کبرابنہ عبداللہ فاقصاہ" (زبیر ہم میں سے تھے، یہانتک کہ ان کا بیٹا عبداللہ بڑا ہوا، اس نے زبیر کو ہم سے دور کر دیا) عبداللہ بن زبیر کی ماں حضرت ابوبکر کی بیٹی اور حضرت عائشہ کی بہن تھیں اور عبداللہ کی تربیت بھی حضرت عائشہ نے ہی کی تھی، اس لیے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ام المومنین نے حضرت عبداللہ کے دل میں علیؑ کے خلاف کس قدر جذبات مخالفت ودیعت کیے ہوں گے۔ اور یہی وہ سبب ہے جس کی بناء پر عبداللہ نے اپنے والدِ بزرگوار کو امیر المومنینؑ سے مخالف بنا دیا۔ مزید برآں شوریٰ کمیٹی کا ممبر ہونا بھی زبیر کے طمعِ خلافت کا سبب بنا۔ دراصل یہی دو باتیں ہیں جنھوں نے زبیر کو علی علیہ السّلام کا مخالف بنا دیا تھا۔

مختصر یہ کہ طلحہ و زبیر دونوں اپنی ذات کے لئے خلافت و حکومت کے طلبگار تھے۔ لیکن جب خلافت نہ مل سکی تو کوفہ و بصرہ کی صوبیداریاں طلب کیں۔ جب اس موقعہ پر بھی کامیابی نہ ہوئی تو سرکشی پر تل گیے، اور خونِ عثمان کے بہانہ سے بصرہ کی جانب روانہ ہو گیے۔ مگر اُن کا یہ بہانہ بھی دیر تک پوشیدہ نہ رہا اور اسی وقت اربابِ بصیرت بھانپ گئے کہ ان کے ارادے کچھ اور ہیں۔

امام حاکم نیشاپوری نے بسلسلۂ اسناد اسرائیل بن موسٰی سے روایت کی ہے کہ:۔

"جب طلحہ و زبیر بصرہ پہنچے تو لوگوں نے پوچھا کیسے آنا ہوا؟ انھوں نے کہا کہ ہم عثمان کا انتقام لینے آئے ہیں۔ اس پر حسن بصری نے کہا سبحان اللہ! کیا لوگوں کو عقل نہیں ہے؟ وہ یہ نہیں کہیں گے کہ تمہارے سوا اور کسی نے عثمان کو قتل نہیں کیا؟" (مستدرک حاکم جلد ۳ ص ۱۱۸)

خود حضرت امیر المؤمنین علیہ السّلام نے اس سلسلہ میں انھیں کافی سمجھانے کی کوشش کی اور بار ہا یہ کہا کہ خونِ عثمان کے الزام سے میں بالکل بری ہوں۔ حضرت امیر المومنینؑ ان کے جواب میں ایک موقعہ پر فرماتے ہیں:۔

" خدا کی قسم انھوں نے مجھ پر کوئی سچا الزام نہیں لگایا اور نہ ہی انھوں نے میرے اور اپنے درمیان انصاف ہی برتا۔ وہ مجھ سے اس حق کا مطالبہ کرتے ہیں جسے خود انھوں نے ہی چھوڑ دیا، اور اس خون کا عوض چاہتے ہیں جسے خود انھوں نے ہی بہایا"

(نہج البلاغہ جلد دوم ص۲۶ مطبوعہ مصر)

امیر المؤمنین علیہ السّلام کا ارشادِ گرامی سب سے بڑا ثبوت ہے اس بات کا کہ طلحہ و زبیر مخالفینِ عثمان سے تھے اور ان کے خلاف محاذ قائم کرنے والوں کے لیڈر تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ عثمان کو یا تو معزول کردیں یا قتل کردیں اور خلافت ہمارے ہاتھ لگ جائے۔ اس نقطہ پر دونوں حضرات متحد تھے۔ چنانچہ جنگِ جمل جاتے وقت مختلف مقامات پر انھوں نے اپنے باطنی خیالات کا اظہار بھی کردیا تھا جیسا کہ تاریخ سے یہ امر اچھی طرح ثابت ہے۔

اُمُّ المؤمنین کی مخالفت امیر المؤمنینؑ سے

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ جناب امیر المؤمنینؑ سے کیوں ناراض تھیں؟ اس بات کی بہت سی وجوہات ہیں جن کا تفصیلی تذکرہ ہمارا موضوعِ بحث نہیں اور نہ ہی یہ مختصر تالیف اُن تمام امور کی متحمل ہو سکتی ہے۔ تاہم انکشافِ حقیقت کے لئے کچھ عرض کردینا ہی مناسب ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری لکھتے ہیں:۔

" میرا اعتقاد یہ ہے کہ عائشہ دوسری ہی وجہ سے علیؑ سے متنفر

تھیں۔ ایک بات تو ایسی ہے جس میں علیؑ کا کوئی اختیار نہیں، اور وہ یہ کہ علیؑ کی شادی دخترِ پیغمبرؐ فاطمہ زہراؑ سے ہوئی۔ اور خداوندِ عالم نے ان فاطمہؑ سے علیؑ کو حسنؑ اور حسینؑ ایسے فرزند عنایت کیئے۔ اس طرح علیؑ پیغمبرؐ کی باقی رہنے والی ذریت اور اولاد کے باپ ہوئے اور عائشہ کو رسول اللہؐ سے کوئی بچہ نہ ہوا۔ حالانکہ پیغمبرؐ کی آخری عمر میں ماریہ قبطیہ مادرِ ابراہیم کے بطن سے بچہ ہوچکا تھا۔ پس یہی بانجھ پن اُن کے لیئے سوہانِ روح تھا۔ اور پیغمبرؐ کی سب سے زیادہ پیاری بیوی ہونے کے اولاد سے محروم رہیں۔

دوسری بات یہ کہ علیؑ نے اسماء خثعمیہ زوجہ ابی بکر سے اُن کے مرنے پر شادی کرلی۔ یہی اسماء محمدؐ بن ابوبکر کی ماں تھیں۔ وہ محمدؐ جو علیؑ کی آغوش میں پلے بڑھے۔ پس ان تمام وجوہ واسباب سے عائشہ علیؑ پر غضبناک تھیں ۔"

(الفتنۃ الکبرٰی جلد دوم ص ۲۹)

امیرالمومنین علی علیہ السّلام اور حضرت عائشہ کی مخالفت کی وجوہات پر سیر حاصل تبصرہ استاد عبد الفتاح عبد المقصود مصری نے نہایت شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ فاضلِ مذکور کی تحقیقات سے ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے بھی استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ ہم ایسے فاضل مورّخ کے تبصرہ کو "اموی دورِ خلافت" کے جلیل القدر مؤلف کے اعتماد اور حوالہ سے ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ فاضل مورّخ لکھتے ہیں:-

"سچی بات یہ ہے کہ آج کے دن عثمان کی حمایت کی ان کے پاس کوئی معقول دلیل نہ تھی سوا علیؑ کی دشمنی وعداوت کے۔ یہ عداوت ہزاروں دلیلوں کی ایک دلیل تھی۔ وہ ہمیشہ ہی ان سے ناراض رہیں، ان کے شعور و احساس میں علی کی نفرت ہمیشہ جاگزیں رہی۔ وہ پہلے عورت تھیں بعد میں عائشہ۔ اُن کی خصلتیں بھی عورتوں جیسی تھیں اور طبیعت بھی عورت کی سی تھی

احساسات شعور کے تابع تھے اور جوش و ہیجان اندر ہی اندر برپا تھا، اور اس پر انھیں کوئی قابو حاصل نہ تھا۔ وہ بہت پہلے ہی سے علیؓ کی عداوت کلیجے میں سمیٹے بیٹھی تھیں۔ اس کے علاوہ حضرت عائشہ میں بھی رشک کا مادّہ اُسی طرح تھا جس طرح ہر عورت میں ہوتا ہے۔ ہر عورت ماں بننے کی تمنّا و آرزو میں بے چین رہتی ہے، برابر آس لگی رہتی ہے کہ گود ہری ہو اور شوہر سے سسرال والوں سے سُرخروئی نصیب ہو۔ مگر قضا و قدر نے ان کے خوبصورت خوابوں کی تعبیر نہ دی جب تک اُن کے شوہرؐ زندہ رہے وہ بانجھ ہی رہیں۔ ان کے مقدر میں ہی نہ ہوا کہ زوجیت کو اولاد کے ذریعہ نبوّت کے رشتہ سے استوار کر سکیں۔ کتنا کتنا انھوں نے چاہا کہ پیغمبرؐ کو ایک بچّہ پیدا کر دیں جو اُن کے خون اور پیغمبرؐ کے صلب سے ہو اور پیغمبرؐ کی پدرانہ محبّت و عطوفت اسے نہال کیا کرے اور خود پوتے پڑوتوں میں مدتوں زندہ رہیں۔ لیکن اس نعمت سے وہ یکسر محروم رہیں اس محرومی نے انھیں انتہائی محزون بنا دیا۔ میرا خیال ہے کہ اس منزل پر اُن کے شعور و احساسات حسرت کے مشابہ تھے۔ وہ اپنی آنکھیں اٹھا کر دیکھتیں تو انھیں نظر آتا کہ ان کے شوہرؐ اپنی بیٹی کو محبّتوں کا خزانہ دیئے دیتے ہیں، مگر اس کو کیا کیا جائے کہ یہ خصوصی نعمت خدیجہ کے نصیب ہوئی۔ وہ مرنے کے بعد بھی پیغمبرؐ کی ذرّیت میں قیامت تک زندہ رہیں خدیجہ پیغمبرؐ کی پہلی رفیقۂ حیات جو چوتھائی صدی تک پیغمبرؐ کی شریکِ زندگی رہیں اس پورے عرصہ میں انھوں نے ایک مرتبہ بھی پیغمبرؐ کو ناراضی کا موقعہ نہ آنے دیا۔ پیغمبرؐ نے اُن سے اُس وقت شادی کی جب پیغمبرؐ کا عنفوانِ شباب تھا۔ اور خدیجہ جوانی کی منزلیں طے کر کے بڑھاپے کی

حدوں سے قریب ہو رہی تھیں۔ مگر پیغمبرؐ نے کسی دوسری بیوی کی ضرورت محسوس نہ کی اور خدیجہؓ کے مرنے کے بعد بھی کوئی عورت پیغمبرؐ کو اتنا خوش نہ کر سکی جتنا خدیجہؓ نے کیا۔ خدیجہؓ نے ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود پیغمبرؐ کی وہ محبت حاصل کر لی جو عائشہ نے کم سنی اور دوشیزگی کے باوجود حاصل نہ کی۔ خدیجہؓ نے ادھیڑ عمر ہونے کے باوجود پیغمبرؐ کو بچے پیش کیا اور عائشہ قاصر رہیں۔ خدیجہ مرنے کے بعد بھی پیغمبرؐ کے دل کی گہرائیوں میں متمکن رہیں۔ پیغمبرؐ اٹھتے بیٹھتے عزت و احترام کے لفظوں سے خدیجہؓ کو یاد کیا کرتے، عائشہ سنتیں اور محسوس کرتیں کہ خدیجہؓ دنیا میں نہ ہونے کے باوجود ہمارے شوہر کی محبت کے بہت بڑے حصہ پر قابض ہیں۔ خود حضرت عائشہ نے اپنے جذبات و خیالات کی ترجمانی کی ہے :۔ "ما غرت علی احد من نساء النبی ما غرت علی خدیجۃ" (جتنا میں نے خدیجہ پر رشک کیا اتنا پیغمبرؐ کی کسی دوسری بیوی پر نہیں حالانکہ خدیجہ کو میں نے دیکھا بھی نہیں تھا) تو خدیجہ مرنے کے بعد بھی باقی تھیں۔ قلب و دماغ میں پیغمبرؐ کے اسی طرح رچی بسی تھیں جس طرح کل وہ پیغمبرؐ کی دنیا میں تھیں۔ عائشہ ہمیشہ خدیجہؓ سے ہراساں رہیں سال پر سال گزرتے رہے مگر اُن کے دل سے خوف نہ گیا، نہ ان کی سوکن خدیجہ کی تصویر اُن کی آنکھوں سے دور ہو سکی۔ زمانہ نے بھی خدیجہ ہی کا ساتھ دیا اور انھیں مکرر زندگی کی طرف پلٹاتا رہا اور اُن کے نواسے نواسیوں کی شکل میں اسی طرح دہرا کر لایا جیسا بیٹیؓ کی شکل میں پہلی مرتبہ دہرا چکا تھا۔ یہ مختلف تصویریں حسنؑ و حسینؑ اور زینبؑ و ام کلثومؑ کے روپ میں عائشہ کے سامنے ہر روز آتیں اور اُن کے گھر میں گھومتی پھرتیں اور اُن کے کان

اور اُن کی آنکھوں میں سما جاتیں۔ عائشہ کی نگاہیں جب پیغمبرؐ پر پڑتی ہونگی وہ پیغمبرؐ کو اپنے نواسے کے ساتھ کھیلتے۔ ان کے ساتھ پیغمبرؐ کی وہ بھرپور چاہت وہ فریفتگی دیکھتی ہونگی تو کون بتا سکتا ہے کہ اُن کے دل پر کیا گزرتی ہوگی۔ اللہ ہی جانے ان کا وہی سوتاپا اور خدیجہؑ سے ان کی جلن آج کے دن خدیجہ کے چہیتوں کے لئے جاگ اٹھی تھی یا اولاد سے محرومی کی حسرت اس نوبت کو پہنچ گئی تھی یا یہ علیؑ کی دشمنی تھی وہ علیؑ کہ بس انہی سے اُن کے شوہر محمد مصطفےٰؐ کی نسل ہمیشہ کے لئے باقی رہی"۔

(الامام علی ابن ابیطالب۔ جلد دوم مطبوعہ مصر دوسرا ایڈیشن : ماخوذ اموی دور خلافت ص ۲۵۵ طبع ثانیہ)

یہ تمام وجوہات مخالفت کی ایسی تھیں جو فطرتاً صنفِ نازک میں اغلباً پائی جاتی ہیں۔ اِلّا یہ کہ کسی خاص شخصیت میں عصمت ان جذبات و احساسات سے مانع ہو۔ ام المومنین علی اور اہلِ بیت سے یہ مخالفت زمانہ رسالت سے ہی شہرت پا چکی تھی۔ مورخین کا بیان ہے کہ وہ اسی فطری کسک کی بنا پر علیؑ کا نام تک لینا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں۔ پیغمبر اسلام کے بعد مسندِ اقتدار کے فیصلہ میں اس محترمہ خاتون کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ میرے خیال میں عائشہ پیغمبرؐ کی زوجہ نہ ہوتیں تو امیدوارانِ خلافت کے سقیفہ کے روز کی کامیابی ناممکن ہو جاتی۔ پیغمبرؐ اسلام کے آخری وقت میں امامتِ نماز کا قضیہ اور اس کے بعد جیش اسامہ کی روانگی میں رکاوٹ ڈالنے کا کارنامہ حضرت عائشہ ہی کا مرہون منت ہے وفاتِ رسولؐ کے بعد روضہ رسولؐ میں شیخین کا دفن ہو جانا اور پیغمبرؐ کی اکلوتی بیٹی اور محبوب نواسے جناب حسنؑ کا اپنے پہلو سے دُور ہو جانا حضرت عائشہ ہی کے اثر و اقتدار کا نتیجہ تھا۔ اور تمام مقامات میں خاندانِ رسالت کے ساتھ ایسی عداوت کے جذبات کارفرما ہے جو وہ شروع سے ہی اپنے دل میں لئے ہوئے تھیں۔ اس پر مستزاد یہ ہوا کہ مسندِ اقتدار و حکومت عائشہ کے باپ کو حاصل ہو گئی۔ اور اس حکومت کے حزب

مخالف یعنی علیؑ اور ان کے اہلِ بیت نے کبھی بھی اس اقتدار کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کیا۔

استاد عبدالفتاح اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے بیانات کے مطابق یہ مخالفتیں تو حضرت عائشہ کے دل میں پہلے سے جا گزیں تھیں۔ ان پر زیادتی یہ ہوئی کہ حضرت عثمان کے قتل ہونے کے بعد وہ جو چاہتی تھیں وہ نہ ہوا۔ اور خلافت اسی علیؑ کے پاس پہنچ گئی۔ ان تمام مخالفتوں کو دل میں رکھکر حضرت عائشہ حج کے بہانہ سے حضرت عثمان کو محاصرہ ہی میں چھوڑ کر اور پبلک کو ان کے خلاف مشتعل کر کے مکہ کی جانب چلی گئیں۔ اور راستہ میں جناب طلحہ کی خلافت کے اشارے لوگوں کے سامنے کرتی رہیں۔ مگر تھوڑی دور جاکر جب یہ خبر ملی کہ عثمان قتل ہو گئے اور مہاجرین و انصار نے علی علیہ السّلام کو خلیفہ چن لیا ہے تو آپ کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اور اب بجائے اظہارِ مسرت کے ٹھنڈی سانسیں لینی شروع کر دیں۔ قیس ابن حازم بیان کرتا ہے:

"جب ام المومنین نے اس خبرِ وحشت اثر کو سنا تو کہنے لگیں کہ کاش! یہ زمین و آسمان پھٹ پڑتے۔ پھر آپ نے اپنی سواری کو مکہ پلٹنے کا حکم دیا۔ میں نے تمام راستہ میں ان کو دیکھا کہ وہ بار بار اپنے نفس سے یوں مخاطب ہوتیں" قتلوا ابن عفان" (لوگوں نے عثمان کو مظلوم قتل کیا) میں نے عرض کیا۔ اے مادرِ گرامی قدر! ابھی ابھی میں نے آپ سے یہ سنا کہ خدا عثمان کو غارت کرے۔ یہ بھی دیکھ چکا ہوں کہ آپ سب سے زیادہ عثمان کی دشمن تھیں۔ عائشہ نے کہا کہ ہاں بات تو ایسی ہی ہے۔ مگر میں نے اس کے بعد اس معاملہ میں غور کیا تو اس نتیجہ پر پہنچی کہ لوگوں نے ان سے توبہ کرائی اور جب وہ مثل چاندی کے صاف ہو چکے تو لوگوں نے انھیں قتل کر ڈالا۔"

(تاریخ طبری جلد ۳ صـ۴۷۷ مطبوعہ لیڈن)

اسی دوران میں قتلِ عثمان کے موضوع پر عبدابن کلاب اور ام المومنین حضرت عائشہ کا جو مکالمہ ہوا اس کو مورّخ طبری نے تفصیلاً درج کیا ہے۔ ہم ابن کلاب کے چند شعروں کا ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ ابن کلاب ام المومنین کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست۔ آپ ہی نے حضرت عثمان کے قتل کا حکم دیا اور آپ ہی نے ان کے خلاف ایسے ایسے فتوے صادر کئے ہم نے آپ کی اطاعت کی اور انھیں مار ڈالا۔ ہمارے نزدیک عثمان کا قاتل وہی ہے جس نے اُن کے قتل کا حکم دیا۔"

(طبری جلد ۳ ص ۴۷۷ مطبوعہ لیدن)

مختصر یہ کہ مورخین نے جو بیانات طلحہ و زبیر اور ام المومنین کے متعلق تحریر کئے ہیں اُن سے اِن تینوں بزرگواروں کے قلبی تاثرات کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ حضرات طلبِ خلافت اور حضرت علیؑ سے پرانی عداوت کے سبب سے حضرت امیر المومنین علیہ السّلام کے خلاف آمادۂ پیکار ہوئے۔ مفتیِ دیارِ مصر علامہ محمد عبدہ شارح نہج البلاغۃ کا بیان ہے:۔

"جب طلحہ و زبیر علیؑ ابن ابیطالبؑ کی بیعت کر چکے تو آپ کو مدینہ چھوڑا اور خود دونوں مکّہ روانہ ہوگئے۔ اس حال میں کہ دونوں غصّہ سے بھرے ہوئے تھے۔ یہاں آکر حضرت عائشہ سے ملاقات کی انھوں نے اُن سے واقعات پوچھے اور طلحہ و زبیر نے سب واقعہ بیان کیا کہ اب اہل مدینہ اس حال میں ہیں کہ نہ حق کو پہچانتے ہیں نہ باطل کا انکار کرتے ہیں حضرت عائشہ نے کہا کہ ہمیں ان لوگوں کی جانب متوجہ ہونا چاہیئے۔ ایک شخص نے جواب دیا جو اس مجمع میں موجود تھا کہ شام میں تو معاویہ موجود ہیں اور وہ وہاں کا کام سنبھالے رہیں گے، لہٰذا شام جانے کی ضرورت نہیں بصرہ چلئے، اور بصرہ والے طلحہ کو چاہتے بھی ہیں کہ وہ خلیفہ وامیر

ہوں۔ چنانچہ ان سب نے بصرہ کا قصد کیا اور علی بن منبہ نے سامان سفر میں مدد دی اور تمام چیزیں مہیا کیں، اور ایک اونٹ جس کا نام عسکر تھا حضرت عائشہ کی سواری کے لئے فراہم کر کے دیا۔ یہ علی بن منبہ حضرت عثمان کی طرف سے یمن پر والی مقرر ہوئے تھے اور امیر المؤمنین علیؑ ابن ابیطالب نے ان کو معزول کر دیا تھا۔ چنانچہ تین ہزار آدمیوں کو لیکر حضرت عائشہ نے یہاں سے کوچ کیا۔ جب یہ خبر امیر المؤمنینؑ کو معلوم ہوئی تو آپ نے سمجھانے بجھانے اور پند و نصیحت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ مگر کوئی نصیحت کارگر نہ ہو سکی۔ جب آپ مجبور ہو گئے تو آپ نے بھی جنگ کی تیاری کی اور مقام بصرہ میں دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ پھر بھی ایک مدت تک امیر المؤمنینؑ جنگ کو ٹالتے رہے اور آخر کار میدانِ جنگ میں جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے۔ یہی اونٹ جس پر حضرت عائشہ سوار تھیں اس وقت بصرہ والوں کا رہنما تھا۔ اس کے گرد ہزاروں آدمی قتل ہو گئے۔ ستر قریشیوں نے اس اونٹ کی نکیل جنگ میں تھامی اور سب کے سب قتل ہو گئے آخر کار امیر المؤمنینؑ کو فتح ہوئی اور حضرت عائشہ کے لشکر کو شکستِ فاش اٹھانا پڑی اونٹ پَے کر دیا گیا اور لوگ بھاگ گئے۔ اس واقعہ میں طلحہ و زبیر بھی کام آ گئے۔ حضرت عائشہ کے لشکر سے سترہ ہزار آدمی قتل ہوئے اور امیر المؤمنینؑ کی فوج سے ایک ہزار ستر آدمی شہید ہوئے۔

ابن ابی الحدید کا بیان ہے کہ مورخین نے جنگِ جمل کے جو مناظر پیش کئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ ان سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں واقدی نے اس باب کو بہت ہی شرح و بسط سے لکھا ہے جس قدر رجز کے اشعار اس جنگ میں پڑھے گئے اتنے کسی دوسری جنگ میں نہیں سنائی دیئے"

علّامہ مفتی محمد عبدہ و ابن ابی الحدید معتزلی وغیرہ شارحین نہج البلاغۃ اور دوسرے ارباب سیر و رجال کے متفقہ بیان سے پتہ چلتا ہے کہ خروج کرنے والوں نے کسی مقام پر بھی اپنے ارادوں کو ملتوی نہیں کیا بلکہ جس جوش و خروش سے میدانِ جنگ میں آئے تھے آخر دم تک باوجود اس کے کہ حضرت امیرالمؤمنین علیہ السّلام اپنی اطاعت کی طرف دعوت دیتے رہے برسرِ پیکار رہے۔ رہا امیرالمؤمنینؑ کا ذاتی موقف اس جنگ کے متعلق تو وہ صاف ظاہر ہے کہ وہ امامِ وقت ہونے کی حیثیت سے اپنے شرعی نقطۂ نظر ہر وقت بیان فرماتے رہے اور مخالفین کے استدلالات کو خود انہی کے مسلّمات سے ردّ فرماتے رہے۔ امیرالمؤمنینؑ نے کسی موقعہ پر بھی یہ افسوس ظاہر نہیں کیا کہ وہ باغیوں سے جنگ کرنے میں غلط کار ہیں۔ بلکہ ہر وقت مستعد ہی نظر آئے۔ مورخین جو اِن فتنہ و فساد کے واقعات کو ابنِ سبا اور سبائین کے سر تھوپنے کی کوشش کرتے ہیں یہ اُن کی انتہائی جسارت اور سینہ زوری ہے۔ کیونکہ جب ہم امیرالمؤمنینؑ کے تأثرات کو تاریخ اور خود انہی کے خطبات مندرجہ نہج البلاغۃ کو سامنے رکھکر دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کہیں بھی کسی مقام پر جناب امیرالمؤمنینؑ نے اس بات کا افسوس ظاہر نہیں کیا کہ ستر اٹھارہ ہزار مسلمانوں کا خون ان سبائیوں نے ہم سے یونہی کروا دیا۔ یا اس کے برعکس فریقِ مخالف نے ان الزامات کو ابنِ سبا اور اس کے چیلوں کے سر تھوپا ہو۔

شارحین نہج البلاغۃ کا بیان ہے کہ جب امام حسن علیہ السّلام نے امیرالمؤمنینؑ کو جنگِ جمل سے مصلحتاً روکنا چاہا تو آپ نے واشگاف الفاظ میں اپنے پختہ ارادہ کا یوں اظہار فرمایا۔

" خدا کی قسم اب میں بجّو کی طرح نہیں رہ سکتا جس کا بھٹ تھپتھپایا جاتا ہے کہ وہ سو جائے۔ یہاں تک کہ شکاری پہنچے اور اُسے دھوکا دیکر پکڑ لے، بلکہ اب تو میں اہلِ حق اور راستی کو ساتھ لیکر اُن لوگوں سے

جو حق سے رو گرداں ہو چکے ہیں مقابلہ کروں گا۔ فرمانبرداروں کے جلو میں سرکشوں سے جو شک و ریب میں مبتلا ہیں جنگ کروں گا۔ یہاں تک کہ میری زندگی ختم ہو جائے۔ خدا کی قسم! جب سے رسول اکرمؐ نے اس دنیا سے پردہ کیا ہے میں برابر اپنے حق سے محروم کیا جاتا رہا ہوں۔ مجھ پر دوسرے لوگوں کو ترجیح دی جاتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ آج (جمل) کا یہ دن پیش آگیا اور لوگ آمادۂ پیکار نظر آرہے ہیں۔"

(نہج البلاغہ مترجم حصۂ اول صـ ۱۲۵ رئیس احمد جعفری لاہو)

علامہ طبری نے اپنی تاریخ جلد پنجم صفحہ ۱۷۱ میں یہ لکھا ہے کہ:۔

"یہ خطبہ حضرت امیر المؤمنینؑ کا ہے، اور اس وقت فرمایا جب امام حسنؑ نے اپنے باپ کی حالت پر گریہ کیا اور جنگ کرنے سے روکا۔ چنانچہ مقام ذی قار میں جب پہنچے تو حضرت نے مجمع اصحاب میں فرمایا کہ تم لوگوں نے دیکھ لیا کہ ان لوگوں (طلحہ و زبیر و عائشہ وغیرہ) نے کیا کیا۔ امام حسنؑ اٹھ کھڑے ہوئے اور رونے لگے۔ امیر المؤمنینؑ نے فرمایا کہ تم لڑکیوں کی طرح روتے کیوں ہو؟ عرض کی کہ میں نے خدمت میں کچھ عرض کیا وہ آپ نے قبول نہیں فرمایا اور آپ آج بغیر یار و مددگار کے قتل کر دیئے جائیں گے اسی پر روتا ہوں۔ آپ نے فرمایا اچھا ان لوگوں کے سامنے بیان کرو کہ تم نے مجھ سے کیا کہا تھا۔ عرض کیا کہ میں نے یہ کہا تھا کہ آپ کی بیعت پر لوگ اگرچہ بعد قتلِ عثمان مجبور کر رہے ہیں مگر آپ اپنا ہاتھ نہ بڑھایئے۔ دوسری بات یہ عرض کی تھی کہ جب یہ عورت (عائشہ) گھر سے نکلی تھی تو میں نے کہا تھا کہ آپ مدینہ نہ چھوڑیئے اور ان کو نکل جانے دیجئے۔ امیر المؤمنینؑ نے فرمایا بیٹا تم سچ کہتے ہو تم نے یہ باتیں ضرور کہی تھیں مگر خدا کی قسم!

بٹیا اب میں اُس بجّو کی طرح سادہ لوح نہ بنونگا جو صیاد کے فریب میں آجاتا ہے اور کھٹکھٹانے پر سو جاتا ہے"۔

طبری اور نہج البلاغۃ کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت امیر المؤمنینؑ سابقہ خلافتوں کے دور سے بھی اپنی محرومی کا شکوہ کر رہے ہیں جبکہ وہ مصلحت اور بمقتضائے وصیّتِ رسولؐ خاموشی اختیار کر چکے تھے۔ مگر اس وقت کے حالات کے اعتبار سے اور ظاہری اعوان و انصار کی موجودگی میں خاموش رہنا اور باغیوں کو کھلا چھوڑ دینا قرینِ صواب نہیں سمجھتے تھے۔ جنگِ جمل کے حزبِ مخالف کے ساتھ جنگ کرنے کے سلسلہ میں حضرت کی عزیمت اور استقلال اس قدر ترقی پر تھا کہ باوجود اپنے فرزند کے منع کرنے سے بھی نہ رُکے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ناکثینِ بیعت اور قاسطین و مارقین کے ساتھ حضرت امیر المؤمنینؑ مامورِ من اللہ والرسولؐ تھے۔ اور یہی جواز اُن کو آخر دم تک جنگ سے نہ روک سکا۔ مخبرِ صادقؐ نے حضرت امیر المؤمنینؑ کو فرمایا تھا کہ:۔

" یا علی انك تقاتل علی تاویل القرآن کما قاتلت علی تنزیلہ"

(اے علی تو تاویلِ قرآن پر جنگ کرے گا جس طرح کہ میں تنزیلِ قرآن پر لڑا ہوں۔) (صواعق محرقہ ص۷۴ مصر)

جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

"مجھے تین قسم کے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے
ایک ناکثین جنھوں نے بیعت کر کے نکثِ عہد کیا، یعنی اصحابِ جمل،
دوسرے قاسطین، یعنی اہلِ صفین۔ تیسرے مارقین یعنی اہلِ نہروان"۔

(نہایہ ابن اثیر جلد ۴ ص۲۸۴ مطبوعہ مصر لغت نکث)

یہ چند ایک روایت قطع نظر سیاسی حالات کے مذہبی نقطۂ نظر سے ہم نے پیش

کر کے ثابت کرنا چاہا ہے کہ جناب امیر علیہ السلام شرعی حیثیت سے بھی خدا اور رسولؐ کی طرف سے امّ المومنین، طلحہ و زبیر وغیرہم سے جنگ کرنے پر مامور تھے۔ نہ تو امیر المومنینؑ کے سیاسی اقتدار پر سبائی غالب تھے اور نہ ہی ان کا وجود جنگِ جمل کے موقعہ پر کسی فریق میں نظر آتا ہے۔ سب بنا بنایا کھیل ہے اور اصحاب رسولؐ کے متعلق بدگمانی کا نتیجہ۔ موّرخین نے محض اپنے ذہنی مخالفین کو نیچ کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ موّرخین کے بیان کے مطابق اگر کوئی ابنِ سبا تھا اور اس کی باطنی خباثتوں کی وجہ سے جنگِ جمل کا ظہور ہوا تو یہ موّرخین جنگِ جمل پر ہی ابنِ سبا کے تذکرہ کو کیوں ختم کر دیتے ہیں۔ حالانکہ صفین کے موقعہ پر جب فریقین صُلح کر رہے تھے تو وہاں نسبتہ جمل کے میدان کے سبائیوں کو اس سے بھی زیادہ پارٹ ادا کرنا چاہیے تھا حالانکہ صفین کے موقعہ پر جنگ کے حالات لکھتے ہوئے ان موّرخین نے بالکل خاموشی اختیار کی ہے۔ جنگِ جمل کے بعد سبائی گروہ کہاں گیا؟ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ کیا اربابِ بصیرت یہ سمجھنے پر مجبور نہ ہوں گے کہ ابنِ سبا کی داستان الف لیلہ کی کہانی سے ملتی جُلتی ہے۔ چنانچہ اس موقعہ پر ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری اس خیال کو مدِنظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جنگِ صفین میں سبائیوں اور ابنِ سبا کے ذکر سے موّرخین نے جو اعراض کیا ہے اُس سے کم سے کم یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ابنِ سبا بالکل فرضی اور من گھڑت چیز ہے اور جب فرقہ شیعہ اور دیگر اسلامی فرقوں میں جھگڑے چل رہے تھے اُس وقت اِسے جنم دیا گیا شیعوں کے دشمنوں کا منشا یہ تھا کہ شیعوں کے اصولِ مذہب میں یہودی عُنصر داخل کر دیا جائے یہ سب کچھ بڑی چالبازی اور مکر و فریب کی صورتیں تھیں محض شیعوں کو نیچ کرنے کے لئے۔ ورنہ اگر ابن سبا کا معاملہ کسی صحیح بنیاد پر مبنی ہوتا اور معتبر تاریخ

سے اس کا پتہ چلتا ہوتا تو لازمی طور پر اس فرقہ کا اثر و نشان اور اس کا مکر و فریب جنگ صفین میں بھی ضرور ظاہر ہوتا۔ خصوصاً جبکہ تحکیم کے سلسلہ میں اصحاب علیؑ میں اختلاف رونما ہوا، اُس وقت بھی اس فرقہ کا وجود فطری طور پر ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ہم خوارج کے معاملہ میں بھی ابن سبا، کا کوئی وجود نہیں پاتے۔ اس موقعہ پر تمام تاریخیں خاموش ہیں۔

اس خاموشی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اور واقعہ صفین اور فرقہ خوارج کے موقعہ پر سبائیین کے غائب ہونے کی کیا توجیہہ بیان کی جا سکتی ہے؟ ہم تو صرف بس ایک ہی نتیجہ پر پہنچے ہیں اور وہ یہ کہ ابن سبا محض وہمی چیز ہے۔"

(الفتنۃ الکبریٰ جلد دوم ص ۹۸ مطبوعہ مصر)

واقعہ جمل کی بحث کے نتائج

جنگ جمل اور اس کے علل و اسباب واقعیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے ذرا طوالت سے کام لیا ہے۔ جس سے قارئین کو ضرور گرانی محسوس ہوئی ہوگی۔ مگر کیا کیا جائے، ہم جنگ جمل کے واقعات اور اسباب پر تاریخی تجزیہ کرنے کے لئے مجبور تھے اور بغیر اس کے چارہ نہ تھا۔ کیونکہ مورخین و مصنفین کے عائد کردہ الزامات کی تردید کرنے کے بعد یہ بات ضروری تھی کہ ہم محققانہ نقد و نظر سے ثابت کر دیتے کہ:۔

(۱) — طلحہ و زبیر حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السّلام کے پہلے سے ہی مخالف تھے اور اسکے علاوہ حصول خلافت کے لئے بھی کوشاں تھے۔ اسی واسطے انھوں نے حضرت عثمان کے خلاف جد و جہد کی اور آخر کار خلیفۂ وقت کو قتل کرا کے دم لیا اور یہی جذبات ان کو کشاں کشاں جمل کے محاذ جنگ پر لائے، بالآخر اسی میدان میں کام آئے۔

(۲) — امّ المؤمنین حضرت عائشہ اپنی سابقہ عداوتوں کے باعث جو وہ اپنے دل میں

رکھتے ہوئے تھیں حضرت علیؑ کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں، اور باوجود اس کے کہ "قرن فی بیوتکن" کے حکم کے تحت ان کو گھر ہی میں رہنا چاہیے تھا۔ وہ امامِ وقت سے برسرِ پیکار ہوئیں۔

(۳)— طلحہ و زبیر اور امّ المؤمنین وغیرہ اصحابِ جمل کو معاویہ بن ابوسفیان نے بھی کسی قدر شہ دی تھی کہ وہ علیؑ کے خلاف محاذِ جنگ قائم کریں۔ کیونکہ اُس کا مقصد یہ تھا کہ جنگ کی صورت میں دونوں فریق کمزور ہو جائیں گے اور بعد میں مَیں آسانی سے حکومتِ اسلامیہ کو ہتھیا لونگا۔ چنانچہ وہ اسی واسطے جنگِ جمل سے کنارہ کش رہا۔

(۴)— حضرت امیر المؤمنینؑ نے فتنہ و فساد کو فرو کرنے کے لئے ہر چند فریقِ مخالف کو سمجھایا اور اپنی اطاعت کی طرف دعوت دی۔ مگر وہ نہ مانے۔ آخر کار ناکثینِ بیعت سے جنگ کرنے پر مامور ہونے کی حیثیت سے قتال کیا اور نہایت استقلال سے اخیر دم تک لڑتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین کی غلط کاریوں کی وجہ سے ستّرہ اٹھارہ ہزار مسلمان موت کے گھاٹ اُتر گئے۔ جن کی تمام تر ذمّہ داری اصحابِ جمل پر ہی عائد ہوتی ہے۔

(۵)— معلوم ہوا کہ ابنِ سبا اور سبائین کا گروہ مورخین کا خیالی ہیرو ہے، ورنہ اگر اس کی کوئی حقیقت ہوتی تو ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے بیان کے مطابق ان کا وجود قدرتی طور پر صفین و نہروان کے موقعہ پر ضرور اپنے اثر و نشان دکھاتا۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری کا تعارف

ڈاکٹر طٰہٰ حسین دنیائے عرب کے مایۂ ناز ادیب اور بلند پایہ مفکر تسلیم کئے گئے ہیں۔ علمی دنیا میں ان کی تحقیقات قابلِ سند سمجھی جاتی ہیں۔ اور آجکل تمام عالم اسلامی میں ان کو صاحب طرز ادیب اور ماہر نقّاد مانا گیا ہے۔ ان کی تمام تحریریں زبان کی صحت۔ تعبیر پر قدرت اور فنکارانہ مہارت کی آئینہ دار ہیں۔ فاضلِ موصوف کا اپنا ایک نرالا انداز ہے جس میں بڑی کشش اور دلفریبی پائی جاتی ہے۔ خصوصاً تاریخی واقعات کو افسانوی رنگ میں بیان کرنا ان کا طُرّہ امتیاز ہے۔ تاریخی و علمی موضوعات کی بحث کے نازک موقعوں پر ان کا اشہب قلم بڑی چابکدستی اور خوش اُسلوبی سے چلتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جدید عربی ادب پر ان کی تصنیفات دنیائے عرب میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں، اور اس وقت دنیائے عرب میں ان کا ثانی نہیں مل سکتا۔ عربی شعر و ادب۔ عرب شعراء اور تاریخ و تمدن کے بہت سے مسائل پر ان کی گرانقدر تصنیفات نے تمام عرب ممالک میں ان کو غیر معمولی شہرت اور نمایاں امتیاز کا مالک بنا دیا ہے۔ ہر سال ایک آدھ تصنیف ضرور لکھتے ہیں، اور یہ تصنیفات دنیائے اسلام میں نہایت ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ اور وہ کوئی تین ۳۰ کے لگ بھگ ہیں۔

ان کی چند ایک مشہور تصانیف یہ ہیں:-

"۱۔ تجدید ذکری ابی العلامعری، ۲۔ فلسفۂ ابن خلدون، ۳۔ فی الادب الجاہلی، ۴۔ حدیث الاربعا، ۵۔ علی ہامش السیرۃ، ۶۔ الایام، ۷۔ مع المتنبّی، ۸۔ مع ابی العلا فی سجنہ، ۹۔ قادۃ الفکر، ۱۰۔ الوعد الحق، ۱۱۔ الادیب ۱۲۔ من الادب التمثیلی الیونانی، ۱۳۔ رُوح التربیہ، ۱۴۔ حافظ و شوقی ۱۵۔ مستقبل الثقافۃ فی مصر، ۱۶۔ فصول فی الادب والنقد، ۱۷۔ المعذّبون

فی الارض ، ۱۸ - الفتنۃ الکبریٰ جلد اوّل حالاتِ عثمان جلد دوم علیؑ و بنوہ۔"
اسلامی تاریخ کے موضوع پر مؤخر الذکر کتاب خاص طور پر مشہور ہے اور نہایت غیر جانبدارانہ طور پر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ ایران میں چھپ چکا ہے، اور اردو ترجمہ بھی حیدر آباد (انڈیا) میں ہو چکا ہے۔ جلد اوّل (عثمان) کا ترجمہ اردو ادارہ طلوع اسلام کے اہتمام سے پاکستان میں بھی اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں خود مصنّف کا اپنا بیان یہ ہے :-

" میری دلی خواہش ہے کہ اس بحث میں حتی الامکان حق اور صرف حق کو ملحوظ رکھوں اور جہاں تک بس چلے راستی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑوں اس معاملہ میں اپنے آپ کو جادۂ انصاف کا پابند رکھوں اور اس سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہ ہٹوں۔ میری پوری کوشش ہو گی کہ حضرت عثمان کے بارے میں مسلمانوں کی مختلف لڑنے والی جماعتوں میں سے کسی کی طرفداری و حمایت نہ کروں۔ میں نہ پرستارِ عثمان ہوں نہ شیعۂ علی نہ اس قضیہ میں میرا اندازِ فکر حضرت عثمان کے اُن ہمعصروں کی طرح ہے جنھوں نے حضرت عثمان کے ساتھ اس جھگڑے کی مشکلات برداشت کی تھیں اور پھر اُن کے دوش بدوش یا اُن کی وفات کے بعد اس کے عواقب کا بار اٹھایا تھا........ میں اس قضیہ کو ہر قسم کے جذبات و احساسات سے الگ ہوتے ہوئے دین و ایمان سے بالاتر ہو کر محض ایک ایسے مورخ کی نظر سے دیکھنا چاہتا ہوں جو جملہ میلانات و عواطف اور اغراض و خواہشات سے پوری طرح مبرا و منزہ ہو۔ خواہ ان کے مظاہر و مصادر اور غایات کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں "

(الفتنۃ الکبریٰ جلد اوّل اردو صفحہ مطبوعہ لاہور)

اس میں شک نہیں کہ فاضل مصنّف نے اپنے بیان اور دعوے کے مطابق اکثر مقامات پر حق کا ساتھ دیا ہے اور نہایت بے لاگ ہو کر کسی کی بلند شخصیت سے بھی بے پروا ہو کر واقعات اور اختلافات کے پس منظر کو منصّۂ شہود پر لانے کی کوشش کی ہے۔ ہم ان کے اس عظیم کارنامہ کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور مسلمانوں کو اس کتاب کے پڑھنے کی دعوت دیتے ہیں تاکہ وہ دیکھیں کہ عرب ممالک کے نئے مفکّر کس طرح تعصّب سے بالاتر ہو کر سوچتے اور لکھتے ہیں۔

چونکہ ہم نے اپنی تالیف میں اکثر و بیشتر مقامات پر اسی فتنۃ الکبریٰ اور فاضل موصوف کی دیگر تحقیقات کو پیش نظر رکھا ہے، اس لئے ہم نے قبل اس کے کہ "عبداللہ بن سبا" کے بارے میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی تحقیقاتِ جدیدہ کو پیش کریں مناسب خیال کیا کہ ان کا علمی تعارف اور ان کی اس عظیم القدر علمی تصنیف یعنی الفتنۃ الکبریٰ کے متعلق اپنے ناظرین کو روشناس کرائیں تاکہ یہ بات واضح ہو سکے کہ ڈاکٹر موصوف کے افادات کیا حیثیت رکھتے ہیں، اور کیا انھیں بطورِ حجّت یا سند پیش کیا جا سکتا ہے؟۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور ابن سبا

حضرت عثمان کے زمانہ کے سیاسی حالات پر ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ایک گرانقدر تبصرہ پیش کیا ہے۔ جس میں ابن سبا کے وجود و عدمِ وجود پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اور تاریخ و درایت کے اصولوں کے ماتحت یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ابنِ سبا ایک ذہنی اور فرضی شخصیت ہے۔ اور اس کے متعلقہ خیالی داستان کو محض اس لئے بنالیا گیا ہے کہ حضرت عثمان اور ان کے عمّال کے غلط کارناموں پر پردہ ڈالا جا سکے، اور شیعوں کے مذہب میں یہودی عنصر کو داخل کر دیا جائے۔

میرے خیال میں فقط ڈاکٹر موصوف ہی پہلی شخصیت ہے جس نے تمام شیعہ

سُنّی محققین سے قبل اس مفروضہ داستان کے پسِ منظر کو کھلے بندوں تحریر کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب الفتنۃ الکبریٰ کی پہلی جلد جو حالاتِ عثمان پر مشتمل ہے میں ابنِ سبار کے وجود کو قدرے شکوک کی نظر سے دیکھا ہے۔ مگر دوسری جلد "علیؑ و نبوہ" میں مستقل طور پر اور نہایت پختگی اور کامل یقین کے ساتھ ابنِ سبا، اور سبائیین کے وجود کو تاریخ و درایت کی روشنی میں کالعدم قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس ذیل میں اُن کا اپنا بیان ملاحظہ ہو:۔

"جنگِ صفین میں سبائیوں اور ابنِ سبار کے ذکر سے مورخین نے جو خاموشی اختیار کی ہے اُس سے کم از کم یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ابنِ سبار بالکل فرضی اور من گھڑت چیز ہے۔ جب شیعہ فرقہ اور دیگر اسلامی فرقوں میں تنازعات شروع ہوئے تو اُس وقت اس کی تخلیق کی گئی۔ شیعوں کے مخالفین کا مطلب یہ تھا کہ شیعیت کے اصولِ مذہب میں یہودیت کا عنصر داخل کر دیا جائے۔ یہ سب کچھ بڑی زبردست چالاکی۔ چالبازی اور مکر و فریب کی صورتیں تھیں محض شیعوں کو تنگ اور ذلیل کرنے کے لئے۔ ورنہ اگر ابنِ سبار کا معاملہ کسی صحیح بنیاد پر قائم ہوتا اور معتبر تاریخ سے اس کا پتہ چلتا تو ضروری تھا کہ اس فرقہ کا اثر و نشان اور اس کا مکر و فریب جنگِ صفین میں بھی ظاہر ہوتا۔ خصوصاً معاملہ تحکیم کے موقعہ پر جب اصحابِ علیؑ میں اختلاف رُونما ہوا اس وقت بھی فطری طور پر اس فرقہ کا وجود ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ہم خوارج کے معاملہ میں بھی ابنِ سبار کا کوئی وجود نہیں پاتے۔ تمام تاریخیں اس موقعہ پر اسکے ذکر سے خاموش ہیں۔ اس خاموشی کی کیا توجیہہ کی جا سکتی ہے اور واقعۂ صفین اور فرقۂ خوارج کے موقعہ پر ابنِ سبار کے غائب ہونے کی

کیا وجہ بیان کی جا سکتی ہے ؟۔

ہم تو صرف ایک ہی نتیجہ پر پہنچے ہیں اور وہ یہ کہ ابن سبا محض وہمی چیز ہے۔ اور اگر بالفرض اس نام کا کوئی شخص موجود بھی رہا ہو تو اسے ایسی اہمیت ہرگز نہ حاصل تھی جیسا کہ مورخین نے تصویر کشی کی ہے۔ مورخین قتلِ عثمان اور حضرت علیؑ کی خلافت کے پہلے سال میں تو اس کا تذکرہ کرتے ہیں مگر بعد میں بالکل کامل سکوت نظر آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ابن سبا ایک ڈروانی چیز ہے، جسے شیعوں کے دشمنوں نے محض شیعوں کو زچ کرنے کے لئے تلاش کیا۔ اور خوارج کیلئے نہیں کیونکہ خوارج تو مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہی نہ تھے اور نہ انھیں کوئی خلافت و سلطنت سے غرض تھی، وہ تو ایسی قوم تھے جو ہر خلافت پر غضبناک اور ہر حکومت کے باغی رہے، اور جتنی انھیں گنجائش نصیب ہوتی وہ خلفاء و سلاطین سے برسرِ پیکار رہتے، اور بعد میں تو اُن کی کوئی اہمیّت ہی نہ رہی۔ بنو امیّہ کے ختم ہوتے ہوتے وہ بھی برائے نام باقی رہ گئے اور بعد میں بنو عبّاس کے دَور میں تو وہ بالکل کمزور پڑ گئے۔ اب صرف متکلّمین کی کتابوں میں اُن کا وجود باقی ہے۔ لہٰذا وہ خوارج بہرحال ایسی جماعت نہ تھے کہ جن سے اختلاف و نزاع کی صُورت اتنی شدّت اختیار کر لیتی اور نوبت جنگ و جدال تک پہنچتی جیسا کہ شیعوں کے ساتھ یہ نوبت آئی ؛؛

اس کے بعد ہی ڈاکٹر طٰہٰ حسین فرماتے ہیں :۔

" سچّی بات یہ ہے کہ بنی عبّاس کی سلطنت کے استوار ہو جانے کے بعد شیعہ و سُنّی کی باہمی عداوت نے نئے نئے رنگ اختیار کئے

جنگ و جدال۔ پروپیگنڈا بازی اور تبلیغ کے بدلے مکر و فریب۔ افتراء و اختراع کی بہتات ہو گئی۔ انصاف پسند مورّخ کو لازم ہے کہ جب وہ صدرِ اسلام کے فتنوں کی تصویر کشی کرنے بیٹھے تو انتہائی احتیاط سے کام لے۔ اس سے بڑھ کر اور آسان بات کیا ہو گی کہ عراق والے شام والوں کو جھوٹی تہمت لگائیں اور شام والے عراق والوں کو خصوصاً اس وقت جبکہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ مدّتِ طولانی ہو چکی ہے اور صحیح واقعات کی چھان بین دشوار ہے۔"

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

"جو کچھ بھی ہو، علّامہ بلاذری نے نہ تو حضرت عثمان کے زمانہ کے فتنہ و فساد کے ضمن میں اور نہ ہی حضرت علیؑ کی خلافت کے عہد میں عبداللہ بن سبا کا ذکر کیا۔ طبری اور طبری کے وہ رواۃ جن سے مورّخ طبری نے اس قصّہ کو حاصل کیا نیز وہ مورّخین جنھوں نے بعد میں طبری سے اس واقعہ کو لیا سبھی ابنِ سبا، اور اس کے اصحاب کے قصّہ کو حضرت عثمان کے زمانہ کے فتنہ و فساد کے ضمن میں اور حضرت علیؑ کی خلافت کے پہلے سال کے تذکرہ میں تو بڑی شدّ و مدّ کے ساتھ بیان کرتے ہیں مگر اس کے بعد گول کر جاتے ہیں۔ کسی کو بھی ابنِ سبا اور اس کے عقیدتمند یاد نہیں رہتے۔ محدّثین و مناظرین بھی طبری اور طبری کے خوشہ چینوں کے ہی ہمنوا ہیں، طبری کے قصّہ کو سر آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ محدّثین و اربابِ مناظرہ طبری کی بیان کی ہوئی باتوں کے علاوہ اپنی طرف سے بھی ایک نرالی بات اضافہ کر کے بیان کرتے ہیں۔ جس میں وہ منفرد ہیں۔ وہ یہ کہ ابنِ سبا، اور اس کے پیرو حضرت علیؑ کی الوہیت کے

قائل ہو گئے تھے اور علیؓ نے اُن کو آگ میں جلوا دیا تھا۔ لیکن اگر آپ تاریخ کی کتابوں میں محدثین و مناظرین کے چھوڑے ہوئے اس شگوفہ کو تلاش کیجئے تو کہیں پتہ بھی نہ ملے۔ ہمیں تو کہیں بھی معلوم نہ ہو سکا کہ حضرت علیؓ کے مختصر زمانۂ خلافت میں کس سال ان غالیوں کا فتنہ رُونما ہوا۔ شروع زمانۂ اسلام میں لوگوں کو آگ میں جلوا دینا پھر وہ بھی اصحاب پیغمبرؐ اور صالح مؤمنین کی موجودگی میں۔ ایسی معمولی بات نہیں کہ مؤرخین اس سے غافل رہتے اور اُسے اپنی کتابوں میں درج نہ کرتے اور ماہ و سال کی تعیین نہ کرتے بلکہ بالکل ہی سکوت اختیار کر جاتے۔

مورخین کی تمام لمبی چوڑی داستان کا خلاصہ بلاذری نے مختصر لفظوں میں یہ بیان کیا ہے کہ کوفہ کے کچھ لوگ مرتد ہو گئے تھے حضرت علیؑ نے انھیں قتل کر ڈالا۔ مرتد ہونے والے لوگوں کے لیے جو حکم اسلام نے دیا ہے وہ ہر شخص جانتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مرتد سے پہلے توبہ کرائی جائے۔ اگر وہ توبہ کر لے تو معاف کر دیا جائے اور اگر توبہ نہ کرے تو اُسکو قتل کر ڈالا جائے۔ لہٰذا اگر حضرت علیؑ کے زمانہ میں کچھ لوگ مرتد ہو گئے ہوں اور آپ نے اسلام کے حکم پر عمل کرتے ہوئے انھیں قتل کر دیا ہو تو یہ کونسے تعجب کی بات ہے؟ بشرطیکہ یہ قصّہ صحیح بھی ہو۔ اگرچہ بلاذری نے اس قصّہ کو بیان کرتے ہوئے مرتد ہو جانے والوں میں سے کسی کا نام نہیں بتایا اور نہ اس امر کی صراحت کی کہ یہ واقعہ کب پیش آیا تھا۔ بلاذری نے مطلقاً یہ واقعہ بیان کر دیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود بھی اس واقعہ کا یقین نہیں رکھتے تھے" (الفتنۃ الکبریٰ جلد دوم مطبوعہ مصر صفحہ ۹۸ تا ۱۰۲ ڈاکٹر طٰہٰ حسین)

(کتاب علی و فرزندانش ترجمہ فارسی الفتنۃ الکبریٰ جلد دوم بقلم محمد علی خلیلی صفحہ ۱۱۴ تا ۱۱۸ مطبوعہ تہران ایران)

یہی فاضل مصنّف ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری الفتنۃ الکبریٰ جلد اوّل میں حضرت عثمان کے حالات کے ضمن میں یہ بھی لکھ چکے ہیں :-

" میرا خیال یہ ہے کہ جو لوگ ابنِ سبا کے معاملہ کو اس حد تک اہمیّت دیتے ہیں وہ نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ تاریخ پر شدید ظلم کرتے ہیں۔ اِس سلسلہ میں سب سے پہلی غور طلب چیز یہ ہے کہ ان تمام اہم ماخذ میں جو حضرت عثمان کے خلاف رُونما ہونے والی شورش پر روشنی ڈالتے ہیں ہمیں ابنِ سبا کا ذکر ہی نہیں ملتا۔ مثلاً ابنِ سعد نے جہاں خلافتِ عثمان اور اُن کے خلاف بغاوت کا حال رقم کیا ہے وہاں ابن سبا کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ اِسی طرح بلاذری نے بھی " انساب الاشراف " میں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ حالانکہ میرے خیال میں حضرت عثمان کے خلاف بغاوت کے واقعات معلوم کرنے کے لئے " انساب الاشراف " اہم ترین ماخذ ہے۔ اور اس قصّہ کی سب سے زیادہ تفصیل اِسی کتاب میں ملتی ہے .... ابنِ سبا کی یہ داستان طبری نے سیف بن عمر کی روایت سے بیان کی ہے، اور معلوم یہی ہوتا ہے کہ مابعد کے جُملہ مورخین نے اس روایت کو طبری ہی سے لیا ہے۔ معلوم نہیں کہ ابنِ سبا کو عہدِ عثمان میں کوئی وقعت حاصل ہوئی تھی یا نہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر کچھ اس کی وقعت ہوتی بھی تو وہ چنداں معنی نہ رکھتی تھی حضرت عثمان کے عہد کے مسلمان ایسے گئے گزرے نہ تھے کہ اہلِ کتاب میں سے ایک نومسلم جو عہدِ عثمان ہی میں اسلام لایا ہو یہ مقام حاصل کر لے کہ اُن کی عقل و فکر اور حکومت تک سے مذاق کرنے لگے وہ بھی اس طرح کہ اِدھر اسلام لائے اُدھر فتنہ و فساد پھیلانا شروع

کر دے۔ حتیٰ کہ اپنی سازشوں کو تمام سلطنت میں نشر کر دے۔ اگر اس نومسلم کو جو محض مسلمانوں میں شر انگیزی کی خاطر اسلام لایا تھا عبداللہ بن عامر نے یا امیر معاویہ نے پکڑا ہوتا تو اس کے خلاف دونوں میں سے کسی ایک نے یا دونوں نے حضرت عثمان کی خدمت میں ضرور تحریر کیا ہوتا ورنہ دونوں یا دونوں میں سے کوئی ایک ضرور اس کی سخت گرفت کرتا۔ اور عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ اُسے سزا دیئے بغیر نہ رہتے وہ سزا جو حضرت عثمان کے خوف سے محمدؐ بن ابی حذیفہ اور محمدؐ بن ابی بکر کو نہ دے سکے تھے۔ بھلا وہ شخص جو حضرت عثمان سے محمدؐ بن ابی حذیفہ اور محمدؐ بن ابی بکر اور بعض روایات کے مطابق عمّار بن یاسر کو سزا دینے کی اجازت کا طلبگار ہو کیسے ممکن ہے کہ وہ اہلِ کتاب میں سے ایک ایسے آدمی کو سزا دیئے بغیر رہ جاتا۔ جس کے نزدیک اسلام محض مسلمانوں کے مابین آتش افتراق کو مواد دینے کا ایک ذریعہ تھا۔ اور جو مسلمانوں کی نگاہوں میں اُن کے امام بلکہ سارے دین ہی کو مشتبہ بنا رہا تھا۔ اور پھر ظاہر ہے کہ والیانِ مملکت کے لئے اس نومسلم کے تعاقب گرفتاری اور تعزیر سے زیادہ آسان بات کوئی نہ تھی۔ حالانکہ وہ مخالفین کا تعاقب کر کے انھیں گرفتار کرنے یا جلاوطن کر کے انھیں امیر معاویہ یا عبدالرحمٰن بن خالد بن ولید کے پاس بھیج دینے میں کافی مہارت رکھتے تھے۔"

فاضلِ موصوف کچھ آگے چل کر پھر لکھتے ہیں:۔

"عبداللہ بن سبا کے متعلق جو روایات ہیں۔ انھیں درست بھی مان لیا جائے تب بھی گمانِ غالب یہی ہے کہ اس کی تعلیم و تبلیغ اور دعوت فتنہ کے رُونما ہونے اور مخالفت و بغاوت کی آگ بھڑکنے کے بعد

شروع ہوئی ہے۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے فتنہ سے ناجائز فائدہ اٹھایا، لیکن یہ غلط ہے کہ وہ اس فتنہ کو برانگیختہ کرنے والا ہے۔

اِس طرح گمان اغلب ہے کہ شیعہ دشمن عناصر نے عہد بنو امیہ و بنو عباسیہ میں عبداللہ بن سبا، کے معاملہ کو اس لئے مبالغہ کا رنگ دے دیا کہ ایک طرف تو کچھ ایسے واقعات جو حضرت عثمان اور اُن کے والیوں سے منسوب ہیں وہ مشکوک ہو جائیں اور دوسری طرف حضرت علیؑ اور اُن کے ساتھیوں پر زد پڑے اور یہ ظاہر کیا جائے کہ شیعہ ایک یہودی کے جھانسے میں آئے ہوئے تھے جو محض علم دشمنی کے خاطر اسلام لایا تھا۔ ظاہر ہے کہ مخالفین شیعہ نے شیعہ پر اور جواباً شیعہ نے جو جو اتہام اپنے مخالفین پر عائد کئے ہیں وہ حد و حساب سے باہر ہیں۔ اِس طرح وہ اتہامات بھی بہت زیادہ ہیں جو شیعہ حضرت عثمان اور دیگر حضرات کے بارے میں اپنے مخالفین پر عائد کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ان تمام حالات کا جائزہ نہایت تدبّر اور احتیاط سے لینا چاہیئے۔ ہمیں صدرِ اسلام کے مسلمانوں کو اس سے بالاتر سمجھنا چاہیئے کہ اُن کے دین و سیاست اور عقل و حکومت کو ایک ایسا شخص کھلونا بنا لے جو صنعاء کا ہو، جس کا باپ یہودی اور ماں حبشن ہو اور جو خود بھی یہودی ہو، جسے اسلام لائے ابھی زیادہ دن نہ گزرے ہوں۔ مزید برآں یہ کہ اس نے اسلام بھی برغبت یا بخوف قبول نہ کیا ہو، بلکہ محض مکر، سازش اور فریب دہی کی خاطر یہ رُوپ دھارا ہو۔ پھر اُسے حسبِ دلخواہ کامیابی حاصل ہو گئی ہو۔ چنانچہ اُس نے مسلمانوں کو اُن کے امام کے خلاف شورش برپا کرنے پر تیار کر لیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے خلیفہ کو تہِ تیغ کر ڈالا۔ علاوہ ازیں اُس نے

مسلمانوں کو اس واقعہ سے قبل یا بعد منتشر کر کے فرقہ فرقہ اور گروہ در گروہ کر دیا۔"

فاضل مورّخ اس کے بعد حضرت عثمان کے خلاف بغاوت و انتشار کا حقیقی پس منظر بیان کرتے ہوئے یوں خامہ فرسا ہیں:-

"یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو عقل کی کسوٹی پر ثابت نہیں ہوتیں نہ تنقید کی تاب لا سکتی ہیں۔ لہٰذا ان تمام باتوں پر تاریخی امور کی بنیاد استوار کرنا درست نہیں۔ دراصل واضح بات جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں وہ یہ ہے کہ اس دور کی اسلامی زندگی کے حالات طبعی طور پر اختلاف آراء۔ افتراق اہواء اور گوناں گوں سیاسی مذاہب کے ظہور کی طرف مائل تھے۔ ایک طرف تو وہ لوگ تھے جو قرآن و سنّتِ نبویؐ اور سیرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما سے وابستہ تھے۔ اور وہ ایسے نئے امور وقوع پذیر ہوتے دیکھ رہے تھے جن سے اُن کا سابقہ نہیں پڑا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان حالات کا اس طرح حزم و احتیاط۔ قوّت و شدّت۔ بے غرضی اور خوش انتظامی کے ساتھ مقابلہ کیا جائے جس طرح حضرت عمر کیا کرتے تھے۔ دوسری طرف قریش اور دوسرے عرب قبائل کے نوجوان تھے جو نئی صُورتِ حال سے نئے جذبات کے ساتھ دوچار ہو رہے تھے۔ ایسے جذبات جن میں طمع۔ مراتبِ عالیہ کا حصول۔ خود غرضی و خود پرستی۔ خوش رنگ اُمیدیں۔ کسی حد تک نہ ٹھہرنے والی خواہش ملی جلی تھیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ان جذبات میں رشک و رقابت اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی تمنّا بھی شامل تھی۔ یہ باہمی مقابلہ محض بلند مناصب کے حصول ہی کے لئے نہ تھا بلکہ ماحول کی ہر شئے

کو حاصل کرنے کے لئے موجود تھا۔ یہ نئی صورتِ حال فی نفسہٖ اس قابل تھی کہ ہر ناؤ بیر کو اس ڈھرّے پر لگا دے، جس کی جانب وہ چل پڑے تھے۔ ذرا غور کیجئے کہ وسیع علاقے فتح ہو رہے تھے۔ ان علاقوں میں سے بے حساب دولت خراج کی شکل میں ان کے پاس وصول ہو کر پہنچ رہی تھی۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ان علاقوں میں اگر نظمِ حکومت چلانے اور اس جمع شدہ مال سے مستفید ہونے کی غرض سے لوگ باہم رشک و رقابت کے جذبات میں مبتلا تھے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟۔ پھر دوسری طرف وہ ممالک بھی تھے جو ابھی فتح نہیں ہوئے تھے، اور صورتِ حال اس امر کا تقاضہ کر رہی تھی کہ مسلمان اُنھیں بھی دوسرے علاقوں کی طرح زیرِ نگیں کر لیں۔ تو پھر وہ لوگ فتح کے ضمن میں کیوں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش نہ کرتے؟ ان میں سے جو لوگ طالبِ دنیا تھے وہ کیوں فاتحین کی مجد و عزّت اور مالِ غنیمت کے بارے میں رقیبانہ رویّہ اختیار نہ کرتے؟ جو طالبِ آخرت تھے وہ کیوں اجر و ثواب کے طلبگار نہ ہوتے؟ لہٰذا اگر طامع و بلند نگاہ نوجوانانِ قریش ان راہوں سے داخل ہو کر جو اُن کے سامنے کھلی تھیں عظمت۔ تسلط اور ثروت حاصل کرنا چاہتے تھے تو یہ کونسے اچنبھے کی بات تھی؟ اسی طرح اگر انصار اور دوسرے عرب قبائل کے نوجوانوں میں مقابلہ و مسابقت کی رُوح بیدار ہو رہی تھی تو اس میں کونسی انوکھی بات تھی؟ اور پھر جب یہ دیکھ کر کہ خلیفۂ اسلام اُن کے اس جذبۂ مسابقت میں حائل ہو رہے ہیں یا وہ اہم معاملات میں قریش کو اور اس سے زیادہ عظیم الحیثیت امور میں صرف بنی اُمیّہ

کو ترجیح دیے رہتے ہیں - ان کے دلوں میں دردِ محرومی اور غیرت و غضب کی آگ بھڑکے تو اس میں کونسا عجوبہ ہے ؟

بلاشبہ حضرت عثمان نے حضرت سعد کو کوفہ کی حکومت سے معزول کر کے اُن کی جگہ ولید اور سعید کو والی مقرر کیا۔ ابو موسیٰ کو بصرہ سے معزول کر کے عبداللہ بن عامر کو ان کا جانشین مقرر کیا۔ تمام ملکِ شام متحد کر کے امیر معاویہ کے سپرد کر کے اُن کے تسلط کی حتی الامکان توسیع کی۔ حالانکہ قبل ازیں شام کئی صُوبوں میں منقسم تھا اور اس کی حکومت میں قریش کے ساتھ دوسرے عرب قبائل بھی شریک تھے۔ اسی طرح حضرت عثمان نے مصر سے عمرو ابن عاص کو ہٹا کر ان کی جگہ عبداللہ بن سعد بن ابی سرح کا تقرر کیا۔ اور یہ سب والی حضرت عثمان کے اقرباء میں سے تھے۔ کوئی ماں کی طرف سے بھائی تھے اور کوئی رضاعی بھائی۔ کوئی ماموں تھے اور کوئی بنو عبد الشمس سے نسبتِ قریبہ رکھنے کی وجہ سے اُنکے ہم نسب تھے۔ یہ وہ سب حقائق ہیں جن سے مجالِ انکار نہیں ہے۔

یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ حضرت عثمان نے جن لوگوں کو معزول یا مقرر کیا تھا ابن سبا کے ایماء سے نہیں کیا تھا۔ سیدھی سی بات یہ ہے کہ جب بھی شاہوں۔ قیصروں۔ والیوں اور امراء نے اُمورِ حکومت میں اپنے اقرباء کو ترجیح دی ہے لوگوں نے اُسے ہمیشہ ناپسند کیا ہے۔ اس اعتبار سے حضرت عثمان کی مسلم رعایا نے عامۃ النّاس سے ہٹ کر کوئی انوکھی بات نہ کی تھی۔ چنانچہ انھوں نے بھی ہر زمانہ کے عام انسانوں کی طرح بعض معاملات کو ناپسند کیا اور بعض کو تسلیم کر لیا۔"

(الفتنۃ الکبریٰ جلد اوّل ترجمہ اردو مطبوعہ طلوعِ اسلام لاہور صفحہ ۲۸۵-۲۸۶ - صفحہ ۲۹۰-۲۹۳ - الفتنۃ الکبریٰ جلد اوّل حالات عثمان مطبوعہ مصر ۱۹۴۷ء صفحہ ۱۳۲ تا صفحہ ۱۳۴)

دیگر محققینِ اسلام کے بیانات

ابن سبا کے بارے میں

مصر کے نامور فلسفی اور ادیب مورخ ڈاکٹر طہٰ حسین کے پیش کردہ تحقیقی اقتباسات جن کو ابھی ابھی ہم نے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا ہے کو پڑھ لینے کے بعد یہ بات بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے کہ ابنِ سبا، کا مفروضہ قصہ تاریخ اسلام کی ایک اہم فروگزاشت ہے۔ اور سبائیوں کے بارے میں مورخین و متکلمین کے مبالغہ آمیز تذکرے محض ذہنی بے راہ روی اور تعصب کا نتیجہ ہیں۔ اور اس سے ان کی غرض فقط عالمِ اسلام کی ایک اہم مذہبی تنظیم (شیعیت) کو زک پہنچانا تھا۔ ورنہ اگر ان حالات و واقعات کو صحیح تاریخی ماخذوں سے تلاش کیا جائے تو کبھی کوئی گوشت پوست والا انسان ایسا نہیں ملیگا جس کو "عبداللہ بن سبا" کہا جاتا ہو۔

ہم اپنے سلسلۂ بیان میں جس بات کا دعویٰ کر چکے تھے اُس کو تاریخ کی واضح شہادتوں کے ساتھ ہم نے بحسن و خوبی ثابت کر دیا ہے۔ اور یہ حقیقت نکھار کر سامنے رکھدی کہ ابنِ سبا ایک فرضی شخصیت اور من گھڑت چیز ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ہماری کوئی جدت طرازی نہیں، اور نہ ہی "عبداللہ بن سبا" کے متعلق حقیقی انکشاف کا سہرا ہمارے سر پر ہے۔ یہ سب کچھ نقد و تبصرہ اور تاریخی موشگافی اصل میں فاضلِ مورخ ڈاکٹر طہٰ حسین مصری کی ہے۔ اور اس سلسلہ میں تمام اربابِ تحقیق سے وہ بفضلِ خدا سبقت لے گئے ہیں۔

جب انھوں نے اس اہم مسئلہ کی طرف اہلِ علم کی توجہ دلائی تو ہر مکتبِ فکر کے دانشمند اور اربابِ بصیرت نے مزید تحقیقات کی روشنی میں اُسے دیکھا اور سمجھا اور کچھ نہ کچھ لکھا چنانچہ فاضلِ موصوف کے بعد علامہ مرتضیٰ عسکری نجف عراق۔ علامہ محمد حسین الطباطبائی

صاحبِ تفسیر "المیزان"۔ ڈاکٹر علی الوردی پروفیسر بغداد یونیورسٹی۔ استاد عبداللہ سبیتی فاضل عراق۔ علّامہ امینی صاحب الغدیر (عراق) اور ہمارے کرم فرما مدیر اصلاح فاضل سیّد محمّد باقر نقوی (انڈیا) وغیرہ نے ضمناً یا مستقل طور پر "عبداللہ بن سبا" کی خیالی داستان کے موضوع پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے، اور لکھا ہے کہ ابنِ سبا ایک وہمی شخصیت ہے۔

ہم نے بھی اس تالیف میں ان تمام حضرات کے مصنفات اور تحقیقات کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ ذیل میں ہم ان نامبردہ محققین کے تحقیقی اقتباسات کو اپنے ناظرین کی خدمت میں پیش کر کے ان کو اطمینان دلانا چاہتے ہیں کہ ابنِ سبا اور سبائیوں کے قصے بالکل فرضی ہیں اور یہ کہ افترا پردازی کی یہ رام کہانی اب مسلمانوں میں متفق علیہ نہیں ہے۔

شیعی دانشمند مرتضیٰ عسکری کی تحقیق

ابنِ سبا کے متعلق لکھنے والوں میں شیعی مکتبِ فکر کے فاضل دانشمند علّامہ مرتضیٰ عسکری ہیں جنھوں نے اس تمام لمبی چوڑی داستان کو بے اساس اور موہوم قرار دیا ہے۔ انھوں نے پوری تحقیق اور تنقید کے بعد ثابت کیا ہے کہ ابنِ سبا کوئی شخص نہیں تھا۔ اور اس سلسلہ میں فاضلِ موصوف نے ایک مستقل کتاب بھی "عبداللہ بن سبا" کے عنوان سے تصنیف کی ہے جو عراق میں چھپ چکی ہے۔ ہماری تالیف کے اہم مقامات جو ابنِ سبا کے متعلق ہیں اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ چنانچہ ابنِ سبا کی داستان کے متعلق اُن کی تحقیق یہ ہے:-

"مختصر یہ کہ ابنِ سبا کا قصّہ خوب پھیلا اور مشہور ہوا۔ اکثر مورخین نے اس قصّہ کو سلسلۂ اسناد کے ساتھ ذکر کیا اور بلا واسطہ یا بالواسطہ طبری تک پہنچایا۔ کچھ مورخین ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنی کتابوں میں اس قصّہ کو بغیر حوالہ کے درج کیا ہے۔ لیکن کتاب کے اوّل یا آخر میں مصادرِ کتاب کی فہرست میں طبری کا نام لکھ دیا ہے یا اُن کتابوں کا نام لکھا

ہے جو طبری سے لکھی گئی ہیں۔

ان تمام باتوں سے یہ حقیقت اچھی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ طبری ہی ہے اس قصہ کی بنیاد ڈالی۔ سب سے پہلے اُس نے ہی اپنی تاریخ میں اس قصہ کو جگہ دی۔ اور بعد میں آنے والے مورخین ان پر حیرت انگیز حد تک اعتماد کرتے ہوئے اپنے مصنفات میں اس داستان کو جگہ دیدی۔

اور جب طبری کے سلسلۂ اسناد کو دیکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مورخ طبری نے ابن سباء کے قصہ کو صرف سیف بن عمر راوی سے اخذ کیا ہے۔ گویا سارے اس قصہ کی جڑ اور بنیاد یہی سیف ہے۔ یہ سیف کوفہ کا رہنے والا تھا اور دو کتابوں "الفتوح والردہ" اور "الجمل و سیر" کا مصنف ہے۔ ائمہ رجال اور اعیانِ علم نے سیف کا ذکر ان الفاظ سے کیا ہے :-

"بے شمار گمنام اور مجہول الحال لوگوں سے روایت کرتا ہے ضعیف الحدیث اور متروک الروایۃ ہے۔ حدیثیں از خود بناتا تھا۔ ثقہ لوگوں سے منسوب کر کے فرضی قصے بیان کرتا تھا۔ اس کی مرویہ احادیث منکر ہیں اور خود یہ زندقہ اور وضع کے ساتھ متہم ہے۔"

(فہرست ابن ندیم ص ۱۳۷ ۔ میزان الاعتدال ذہبی جلد ۱ ص ۴۳۸ ۔ تہذیب التہذیب جلد ۴ ص ۲۹۷ اصابہ جلد ۳ ص ۲۳۰ ۔ الاستیعاب جلد ۳ ص ۲۵۲ ۔ اللآلی المصنوعہ حدیث ص ۲۳۳ کتاب عبداللہ بن سبا" عربی مطبوعہ نجف عراق ص ۱۷ ص ۱۸ ص ۱۴۰ ص ۱۴۱ ۔ مصنفہ مرتضیٰ عسکری و کتاب الغدیر جلد ۸ ص ۸۴ ص ۸۵ مصنفہ علامہ امینی عراق)

یہ تھی وہ اجمالی تعریف سیف بن عمر راوی کی جس کو فاضل مصنف نے جلیل القدر علمائے رجال کی شہادتوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مورخ طبری و سیف بن عمر اور

دیگر مورخین کے مصادر و ماخذ پر ہم قبل ازیں تفصیلی روشنی ڈال چکے ہیں۔ یہاں کا تکرار اگرچہ طوالت کا مترادف ضرور تھا مگر اختصار کے طور پر ہم علماء کے بیانات کے ضمن میں فاضلِ مذکور کی تحقیق اور شہادت کو ضرور پیش کرنا چاہتے تھے۔

تحقیقِ فاضل علامہ استاد عبداللہ السبیتی (عراق)

استاد عبداللہ السبیتی عراق کے مشاہیر شیعی علماء میں سے ہیں۔ اور ان کی تالیفات گرانقدر علمی سرمایہ ہیں جن میں سے "تحت رایۃ الحق"، "المباہلہ"، "حجۃ الوداع"، "سلمان الفارسی"، "ابوذر غفاری"، "عمار یاسر" اور "حجر بن عدی الکندی" وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

فاضل علامہ نے ایک کتاب "الی مشیختہ الازہر" کے نام سے لکھی ہے جس میں جامع ازہر مصر کے سنی فاضل سعد محمد حسن کی تالیف "المہدویۃ فی الاسلام" کا پورا پورا علمی تعاقب کیا گیا ہے۔ شیعی فاضل کی یہ کتاب کئی جہات سے قابلِ توجہ اور گرانقدر علمی معلومات کا ذخیرہ ہے۔ سعد محمد حسن مصری نے جہاں اپنی دستاویز میں دیگر مسائل کا ذکر کیا ہے وہاں ابنِ سبا کی مفروضہ داستان پر بھی خامہ فرسائی کرتے ہوئے شیعیت پر بھی ناروا نکتہ چینیاں کی ہیں۔ چنانچہ استاد عبداللہ سبیتی اپنی کتاب میں ابنِ سبا کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "یقین جانیئے کہ ابنِ سبا اور سبائین کسی دور میں بھی نہیں ہو گزرے یہ ایک خیالی داستان ہے جس کو شیعوں کے دشمنوں نے از خود وضع کر کے شیعیت کے سر تھوپ دیا ہے۔ ہمیں مکمل یقین ہے کہ جو شخص ابنِ سبا سے منسوب خرافات کو تاریخ سے مطالعہ کریگا وہ ماننے پر مجبور ہو گا کہ یہ ایک فرضی وجود ہے اور جس کی حقیقت کچھ بھی نہیں حقیقت پردہ پوشی اور القاء تہمت وغیرہ ایک ایسا وسیلہ ہے کہ ہر دور کی سیاست

نے اس کو اپنا کر اپنے دشمن کو زچ کیا اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور یہی سیاست شیعہ کے مخالفین نے بھی اپنائی جس کی بنا پر ابن سبا وغیرہ کا قصہ عالم وجود میں آیا۔ اور واقعتاً یہ مسئلہ ہے بھی عجیب و غریب کہ ابن سبا اور سبائی لوگ عثمان کے زمانہ میں پیدا ہوئے اور قلیل مدت میں اتنی قوت پکڑی کہ خلیفۂ مسلمین کو آنِ واحد میں تہ تیغ کر دیا اور اپنی مساعی سے اتنا اثر باقی چھوڑا کہ مسلمانوں کے اختلافات کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جارہی ہے اور آج تک اس گروہ شقاوت پژوہ کے تأثرات نظر آتے دکھائی دیتے ہیں۔ کیا یہ بات ہنسی اور خندۂ زیر لبی کے قابل نہیں؟ کہ ابن سبا نے یک و تنہا اپنی یہودیانہ تلوار سے اسلام کی عزت و حرمت کو زخمی کر دیا اور اس خنجر سحر آمیز نے آنِ واحد میں دین اور حقیقتِ دین کو اس وقت کے لوگوں سے سلب کر کے دم لیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سیاسی اغراض نے اوہام و خیالات اور سحر و افسوں کی دنیا سے ایک جادوگر پیدا کیا جس کا نام عبداللہ بن سبا رکھا گیا اور تخریب اسلام کے عنوان سے اس کو ایک دستاویز دی گئی جس کی روشنی میں اس نے یہ سب کچھ کر ڈالا۔

تعجب بالائے تعجب تو یہ ہے کہ ابن سبا یہودی نے تو اسلام دشمنی کی بنا پر شیرازۂ اسلامی کو آنِ واحد میں منتشر کر دیا مگر بن گوریون باوجود چالاک اور سیاسی گھاگ ہونے کے فلسطین کے بارے میں کچھ نہ کر سکا۔ حالانکہ یہودی روز اول سے فلسطین کے بارے میں گریہ کرتے نظر آتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن سبا بن گوریون سے بھی زیادہ سیاست میں ماہر تھا۔

اب کیوں نہ اس امر کی تحقیق کر لی جائے کہ اس کہانی کو وضع کرنے میں کونسی غرض مطلوب تھی؟ اس کا جواب ہم یہ دیتے ہیں کہ صدرِ اسلام میں موضوعِ خلافت کے بارے میں جو انتشار جامعہ اسلامی میں رُونما ہوا اس کا تقاضہ یہ تھا کہ ابنِ سبا اور سبائیین کے وجود کو وضع کیا جائے تاکہ ہر مخالف کو ابنِ سبا کی پیروی کے الزام سے ذلیل اور نیست و نابود کیا جا سکے۔ جلیل القدر صحابہ ابوذر، عمّار یاسر اور مالک اشتر وغیرہ کو بھی اس سلسلہ میں معاف نہیں کیا گیا۔ جیسا کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے بھی اس حقیقت کا اعتراف و اظہار کیا ہے (الفتنۃ الکبریٰ فارسی جلد ۲ ص ۱۱۵) اور وہ مکتوب جو زیاد بن ابیہ نے امیر شام کو حجر بن عدی الکندی وغیرہ کی گرفتاری کے بعد لکھا کہ "یہ سبائیہ لوگ ہیں اور امیر المؤمنین معاویہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ خدا نے ان پر ہم کو مسلّط کیا ہے۔ ان کا رئیس حجر بن عدی ہے" (حجر بن عدی۔ مصنفہ آقائی کمرہ ای ص ۴۶) بھی ہمارے مدعا پر روشن دلیل ہے۔ کہ وقتی سیاست نے اپنے تمام مخالفین کو سبائیت کے لقب سے نوازا۔ بہر حال جو شخص بھی ان خلافِ عقل و نقل واقعات کو غور سے مطالعہ کرے گا وہ ہر گز یہ باور نہیں کر سکتا کہ سبائی گروہ بھی تھا، اور اُس نے یہ سارے کھیل کھیلے۔ کیا یہ سچائی اور راستی کی بات نہیں ہے کہ ابن سبا اور اُس کے اتباع حضرت عثمان کے گھر میں اتنی طاقت پکڑ گئے اور عثمانی حکومت کے عمال و گورنران کو تمام ملک پر مسلّط ہوتا دیکھتے رہے اور اُن کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگی؟ یہ ابن سبا، کون تھا؟ جو مسلمانوں کی وسیع و عریض سلطنت میں آزادی کے ساتھ دَورے اور علانیہ تقریریں کرتا رہا اور اپنی تبلیغات کے ذریعہ

حکومت کے خلاف لوگوں کو مشتعل کرتا رہا مگر اموی تلواریں اس کا جواب تک نہیں دیتیں۔ اور حضرت عثمان کے صوبیدار و خیر خواہ اتنا بھی نہیں کر سکے کہ اس کو پکڑ کر کہیں جلاوطن ہی کر دیں۔ جیسا کہ دوسرے مخالفینِ حکومت کے ساتھ برتاؤ کیا جاتا رہا۔

اس بات کو چھوڑیئے اور غور کیجئے کہ کیا ابنِ سباء کے مرید علیؑ کے وہی شیعہ تھے جو پیغمبر اسلامؐ کے مخلص صحابہ اور دین و اسلام کے ستون تھے۔ "حاشا و کلا" تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ابن سبا کوئی وجود رکھتا تھا تو اُس کے پیرو بھی سُنّی ہی تھے۔ کیونکہ سُنّیوں کے اعتقاد کے مطابق تمام صحابۂ رسولؐ اہلِ سُنّت کے مسلک پر ہی گامزن تھے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ ابنِ سباء کے عدم وجود پر جو واضح اور آشکار دلیل پیش کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر ابنِ سباء یہودی کوئی تھا اور وہ سیاست میں اس قدر دستگاہ کامل رکھتا تھا تو اصولاً یہودیوں کے ذخیرۂ تاریخ میں بھی اس کا ذکر ملتا۔ حالانکہ تاریخِ یہود میں اس امر کا نشان تک نہیں کہ ابن سباء کا انجام کیا ہوا؟ اور اُس کے پیرو کہاں گئے؟

یہ ہیں وہ سوالات جو ایک منصف مزاج اور غیر جانبدار انسان کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔"

(کتاب "الی مشیخۃ الازھر" تالیف استاد عبداللہ سبیتی طبع بغداد ۱۳۷۵ھ ص ۱۱۵/۱۱۸

ماخوذ کتاب تشیع ص ۲۲۴/۲۲۶ فارسی مطبوعہ قم)

ڈاکٹر علی الوردی پروفیسر یونیورسٹی بغداد کی تصریحات

ڈاکٹر علی الوردی پروفیسر بغداد یونیورسٹی (عراق)

ابنِ سبا، کی مفروضہ کہانی کے متعلق بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب "وعاظ السلاطین" میں ایک مخالفِ اسلام کا اعتراض بیان کرتے ہیں:۔

"ایک روز ایک شخص اسلام سے مذاق کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ یہ کونسا دین ہے جو اپنی کامیابی اور فتوحات کی ہمہ گیری کے باوجود ایک مسافر اور بے کس انسان کے ہاتھوں شکار ہو جاتا ہے اور تاریخ اس کی اطلاع تک نہیں دیتی۔ اس وقت جبکہ اصحاب پیغمبرؐ وسیع و عریض سلطنت کے مالک تھے اور اپنے پیغمبرؐ کی تعلیمات کو پھیلا رہے تھے ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت ایک یہودی نژاد غیر شعوری طور پر اُن میں داخل ہو جاتا ہے، اور باوجود اصحاب پیغمبر قدرت و طاقت رکھنے کے اُس کو دُور نہیں کر سکے۔ بلکہ خود اسی مردِ غریب کے شکار میں گرفتار ہو گئے۔"

(کتاب وعاظ السلاطین ترجمہ فارسی صـ۱۱۲)

ڈاکٹر موصوف اس کے بعد تحریر کرتے ہیں:۔

"آیا ابن سبا کا وجود تھا یا وہ ایک وہمی شخصیت ہے؟ یہ سوال جو شخص کرنا چاہتا ہے اُس کو چاہیئے کہ اسلام کی اجتماعی تاریخ کا مطالعہ کرے، اور اس کے فیصلوں کو عبرت کی نگاہ سے دیکھے۔ کیا ہمیں اجازت ہے کہ ہم اس سوال کو ایک دوسرے عنوان سے پوچھیں۔ کیا اس وقت اسلام کی اجتماعی حیثیت اس امر کی محتاج تھی کہ وہ فتنہ و فساد کے واقعات میں کسی اجنبی طاقت یا خارجی محرک کی دستِ نگر ہو؟ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابن سبا کی داستان وضع کرنے والے مورخین کے خیال میں صدرِ اسلام کا معاشرہ اور اُس وقت کی اسلامی سوسائٹی بالکل اطمینان اور آرام و سکون سے زندگی بسر کر رہی تھی اور فتنہ و فساد

کا کوئی ایسا موضوع نہ تھا جو اس معاشرے کے قلق و اضطراب کا موجب بنتا۔ ہمارے خیال میں یہ مورّخ اپنے افکار کی بست و کشاد میں ارسطو کے فلسفۂ قدیم کے پیرو ہیں۔ ان کی نگاہوں میں کسی معاشرے اور ادارے کی انقلابی حرکت قاعدہ و قانون اور فطرت کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی اجتماعی انقلاب کو یہ حضرات دیکھتے ہیں تو اس کی علّت کے متعلق سوال کر دیتے ہیں۔ حالانکہ جدید فلسفہ اس بات کا اعتقاد رکھتا ہے کہ ہر اجتماعی ادارہ طبعی اور فطری طور پر تغیّر اور حرکت کا متقاضی ہے۔ اور اس متغیّر حالت کو علمی اصطلاح میں (PSOCPSS) کہتے ہیں۔ اسی لحاظ سے جدید فلسفہ کے حاملین جب کسی اجتماعی حیثیت کو روبہ انقلاب دیکھتے ہیں تو وہ حیران نہیں ہوتے۔ بلکہ بر خلاف اسکے اگر وہ اجتماعی ادارہ ساکت اور بے حرکت ہو تو جدید فلاسفر متعجّب ہو کر تحقیق کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟

ابنِ سبا کہ جسے ان تمام فسادات اور شورش انگیزی کا بانی اور محرّک قرار دیا جاتا ہے۔ اُس سلسلہ میں ایک موہوم سی شخصیت معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے بھی کہا ہے۔ اور ایسا ہی دکھائی دیتا ہے کہ اس عجیب شخصیت کو از خود بنا لیا گیا ہے۔ یہ ذہنی تخلیق اُس دولتمند گروہ کی ہے جس کی ضد میں یہ شورش بپا ہوئی۔ یہ طریقہ اور روش عموماً ایسے ہی طبقات کی ہوتی ہے جو وہ ہر تاریخی دور میں اربابِ اقتدار کے خلاف انقلابیوں کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔ یہ بات تاریخ سے ثابت ہے کہ تاریخ کے ہر انقلابی موڑ پر انقلابی تحریک کے مخالفین اس کی تاثیر اور محرّکات کو اجنبی آدمیوں سے ہی منسوب کرتے رہتے ہیں۔ پروفیسر

سمل جو علم الاجتماع کا معروف محقق ہے۔ اس نے اس ذیل میں کافی تحقیق کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ "ابتدائے دعوتِ اسلام میں قریش نے پیغمبرِ اسلامؐ پر یہ تہمت لگائی کہ محمدؐ اپنی تعلیمات کو ایک جبر نامی عیسائی سے دریافت کرتا ہے اور جو کچھ بھی کہتا ہے وہ اسی عیسائی کی تعلیمات کے مطابق ہے۔" (کتاب زندگانی محمدؐ، مولفہ محمد حسین ہیکل مصر ص ۱۳۶)۔ بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ "پیغمبرِ اسلامؐ کے مخالف اربابِ طاقت نے آپ پر یہ بھی الزام لگایا کہ یہ محمدؐ اپنے افکار و نظریات میں بحیرا راہب اور سلمان الفارسی اور اسی طرح دوسرے لوگوں کا محتاج ہے۔" (شخصیات قلقہ فی الاسلام ص ۳۳ عبد الرحمٰن بدوی)۔ مختصر یہ کہ پروفیسر سمل کے بیان کے مطابق اربابِ اقتدار ہمیشہ انقلاب کے محرکات و عوامل کو اجانب سے ہی منسوب کرتے رہے۔ اس قسم کے الزامات کو تاریخ کے مختلف مراحل میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔" (کتاب نقش وعاظ در اسلام ص ۱۱۴/۱۱۵ ڈاکٹر علی الوردی)

"افسانہ گو مورخین نے حضرت عثمان کے خلاف فتنہ و فساد کے واقعات کو ابنِ سبا کے سر تھوپا ہے جو یہودی تھا اور بن بلائے اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے حلقہ بگوشِ اسلام ہوا تھا حقیقت یہ ہے کہ عثمان کے زمانہ میں عثمانی حکومت کے عمال اور صوبیدار لوگوں کی عدم رضامندی اور ان شکایات کی وجہ سے جو سرمایہ دارانہ نظام کی تشکیل کی جہت سے عوام کی طرف سے ان پر کی جاتی تھیں پریشان اور ہراساں ہو گئے اور چار و ناچار ان شکایات کو ایک یہودی کی طرف منسوب کر دیا، جو اس لئے آیا تھا کہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنی کرے۔ گویا ان الزامات کی اشاعت سے عثمان کے ہواخواہوں کا مقصد یہ

تھا کہ شورش کی علّتِ اصلی اور فتنہ کے حقیقی اسباب پوشیدہ رہ جائیں۔ جن کارستانیوں اور اعمال کی نسبت عبداللہ بن سبا کی طرف دی جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں تو اتنے اہم اور محال امور سوائے فوق العادت انسانوں کے یا جادوگروں اور شعبدہ بازوں کے ہتھکنڈوں کے کوئی سر انجام نہیں دے سکتا یا ہو سکتا ہے کہ ان تمام لوگوں کو خوابِ غفلت میں مدہوش کر کے ایسا کر دیا گیا ہو۔

ان واقعات کو پڑھنے سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ عبداللہ بن سبا کے پاس کوئی ایسی مقناطیسی طاقت تھی کہ جس کی وجہ سے اس نے پتھروں کو بھی توڑ دیا یا پھر اُس میں ایسی کوئی فوق العادت روحانی قوت موجود تھی کہ جس کی بناء پر لوگ اس کے سامنے بھیڑوں کی طرح مطیع ہو گئے اور بغیر اس کے کہ وہ کوئی حرکت کریں ابنِ سبا کی تمام باتیں اُن میں اثر کر گئیں۔

اگر حضرت عثمان کے زمانہ میں کوئی ایسا فوق العادت انسان ظاہر ہوتا تو لازمی طور پر کسی نہ کسی ذریعہ اس کے اوصاف اور علامتیں ہم تک بھی پہنچتیں۔ عجیب تر تو یہ ہے کہ وہ مستند مصادر کتب اور تاریخی مواد جو خصوصی طور پر مخالفتِ عثمان کے موضوع پر موجود ہے۔ اس میں کہیں بھی ابن سبا کا ذکر نہیں۔ ہم نے کسی بھی معتبر تاریخ میں کوئی ایسی فرضی داستان نہیں دیکھی جو ابنِ سبا کی کہانی کی طرح بے اثر اور لغویات کا طومار ہو۔ ان حالات میں ہمارا تو خیال ہے کہ ابنِ سبا نے تمام جہان کے گناہوں کو اپنے اوپر لے لیا ہے۔ اور اگر فی الواقعہ وہ کوئی شخصیت تھی تو بغیر اس کی مداخلت کے تمام جہان کے الزامات نے اس کی طرف

مُنہ کر لیا ہے۔ اور ان کی وجہ سے وہ رو رہا ہے اور اعتراض کر رہا ہے
الغرض ابنِ سبا، ہر حالت میں آرام سے نہیں بیٹھا ہوا۔ اس کی کوشش
ہمیشہ جاری ہے۔ اور فرصت کو غنیمت شمار کرتے ہوئے وہ ہر آن فتنہ و
فساد کرانے پر آمادہ ہے۔ ممکن ہے کہ ہر شخص العیاذاً باللہ ابنِ سبا ہو جائے"۔

(کتاب نقش وعاظ در اسلام ص ۱۳۱-۱۳۲ فارسی ترجمہ بقلم محمد علی خلیلی)

(۳)

آیا عمار یاسر ہی تو ابن سبا نہیں؟

ڈاکٹر علی الوردی پروفیسر بغداد یونیورسٹی کی پیش کردہ تحقیق سے اتنا تو پتہ چلا کہ
یہ فاضل دانشمند دوسرے محققینِ عصر کی طرح ابنِ سبا کے وجود کا تو قائل نہیں مگر اس
سلسلہ میں ان کا خیال ہے کہ حقیقت میں حضرت عمار بن یاسر صحابیِ رسول ص کو ہی حضرت
عثمان کے ہوا خواہوں نے ابنِ سبا کے نام سے موسوم کیا تھا جو بعد میں غلط فہمی کی
بنا پر ایک علیحدہ شخصیت سمجھ لی گئی۔ ان کے اس بیان کو ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں
ملاحظہ ہو:-

"حضرت عمار یاسر رض پیغمبر اسلام کا وہ جلیل القدر صحابی ہے جس کے
بارے میں خود آنحضرت ص نے بطورِ پیشین گوئی ارشاد فرمایا تھا" یقتلہ
الفئۃ الباغیۃ" (اس کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا۔) چنانچہ
اس خبر کے مطابق حضرت عمار یاسر رض جنگِ صفین میں معاویہ کے ہاتھوں
شہید ہوئے۔ حضرت عمار میدان صفین میں لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے
احتجاجاً فرماتے ہیں:-

" اے بندگانِ خدا! اٹھو اور میرے ساتھ ہو کر اس شخص سے
جنگ کرو جو ایسے شخص کے خون کا مطالبہ کرتا ہے جس کو اس نے خود بہایا
ہے اور وہ کتابِ خدا کے خلاف حکومت کرتا تھا۔ لوگوں نے کہا کہ

اس نے کوئی تازہ بات تو از خود پیدا نہ کی تھی۔ حضرت عمار بولے !
ہاں ایسا ہی کہا تو جاتا ہے۔ مگر بات یہ ہے کہ حضرت عثمان نے ان لوگوں کے لئے سامانِ عیش فراہم کیا۔ انھوں نے اس سے فوائد حاصل کئے اور دنیا کی طرف متوجہ ہو گئے۔ خدا کی قسم! میرا یہ گمان نہیں ہے کہ یہ لوگ حضرت عثمان کے خون کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کیونکہ انھیں اچھی طرح علم ہے کہ اس کے اعمال ہی ایسے تھے جن کی وجہ سے اس کا قتل رونما ہوا۔ حقیقت یوں ہے کہ ان لوگوں کی فطرت اور مذاقِ طبیعت میں لذتِ دنیا سما گئی ہے۔ اور یہ بات بھی ان کو اچھی طرح معلوم ہے کہ اگر حکومت اسلامیہ کی باگ ڈور مردِ حق پرست کے ہاتھ میں رہے تو وہ انھیں اُن کے بُرے اعمال سے روکے گا اور اُن کی دنیا کو اُنکے ہاتھ سے چھین لے گا۔" (کتاب "عمار یاسر" تألیف عبداللہ سبیتی ص۱۵۰ و نقش وعاظ در اسلام ص۲۰۹)

ابن عربی نے "العواصم والقواصم" میں تحریر کیا ہے کہ :۔

"حضرت عمار یاسر حضرت عثمان کے خلاف سخت تنقید کرتے تھے اور برملا کہتے کہ عثمان اسلامی آئین سے انحراف کر چکا ہے۔ انہی امور کے باعث بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ عمار سبائی تھا اور فرقہ سبائیہ نے اس کو اپنے میں شامل کر لیا تھا تاکہ عمار کی وجہ سے وہ طاقت حاصل کر لے۔" (العواصم والقواصم ص۶۴)

فاضل ڈاکٹر علی الوردی اپنی کتاب میں ابن عربی کی عبارت لکھنے کے بعد تحریر کرتے ہیں :۔

"سوائے ابن عربی کے دیگر مؤرخین نے یہ جرأت نہیں کی کہ وہ

عمار یاسر کو ابن سبا کا پیرو لکھیں اور صحابیِ رسولؐ کے بارے میں وہ یہ نفرت آمیز روش اختیار کریں کیونکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ عمار یاسر وہی صحابیِ رسولؐ ہے جس نے راہِ خدا میں بے شمار تکالیف کا سامنا کیا تھا، اور پیغمبر اسلام متعدد بار اس کی فضیلت میں رطب اللسان ہوتے رہے عمار یاسر کا سبائی ہونا تو کجا، ہم آگے چل کر یہ ثابت کریں گے کہ عمار یاسر کو ہی ابن سبا، کہا گیا ہے۔" (نقش وعاظ در اسلام فصل ۷، ص ۲۰۹/۲۱۰)

فاضل مذکور کا بیان ہے:۔

"ممکن ہے کہ کوئی شخص یہ سوال کرے کہ ابن سبا، وغیرہ کا حشر اس میدانِ شورش میں کیا ہوا جبکہ حضرت عثمان کے خلاف رونما ہونے والے واقعات میں اور ان کے بعد کے فتنہ و فساد میں اس کو موجود بیان کیا جاتا ہے۔ مگر جنگِ صفین (جس میں عمار شہید ہوئے) میں اس کا نام و نشان بھی نہیں ملتا اور یہ خطرناک اور شعبدہ باز انسان صفین کے مقتولوں میں بھی نظر نہیں آتا؟

مورخین اس سلسلہ میں قطعاً خاموش ہیں اور حیرت و استعجاب کی وجہ سے کوئی جواب نہیں دے سکے۔ اصل بات یہ ہے کہ ابن سبا جنگِ صفین میں کہیں غائب نہیں ہو گیا تھا۔ کیونکہ اس کا تو وجود ہی نہیں تھا جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں تو اس لحاظ سے اس کا غائب ہونا یا ظاہر ہونا کیسا؟۔ ہم تو بس ایک ہی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ابن سبا کی داستان اوّل سے آخر تک بنائی گئی ہے، اور نہایت چالاکی اور مکر و فریب سے اس کو مکمل کیا گیا ہے۔ کیونکہ قریش فقط سیاست میں ہی چالاک نہ تھے بلکہ وہ اس قسم کی داستانوں کو اختیار کے قالب میں ڈھالنے کے بھی

پُورے پُورے ماہر تھے۔ حضرت عثمان کے زمانہ میں قریش اپنی مخصوص مجالس میں عمار بن یاسر کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کو سب و شتم بھی کیا کرتے تھے اور اسے ابن السوداء کے نام سے ہی پکارا کرتے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی راوی نے ان کی باتوں کو سُنا ہو اور وہ یہ سمجھا ہو کہ ابن السوداء (ابن سبا کا ہی لقب تجویز کیا گیا ہے) عمار یاسر سے کوئی الگ شخصیت ہے۔ پھر اس سلسلہ کو روایت کے طور پر آگے بیان کر دیا ہو حالانکہ قریش کا مقصد ابن السوداء سے عمار یاسر ہی تھا۔ اصلی بات کا کسے علم ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ ابن سبا کے متعلقہ افسانے ابتداً وہم و گمان پر مبنی ہوں اور بعد میں رفتہ رفتہ ان کو افسانوی انداز میں ترتیب دے لیا گیا ہو۔

یہ امر کوئی تعجب خیز نہیں ہے۔ بہت سی باتیں جو ابن سبا اور سبائین کے متعلق مورخین نے بیان کی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر حضرت عمار یاسر کے قول و فعل اور سیاسی کردار سے کافی حد تک ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ ہم ان بعض امور کو جو حضرت عمارؓ سے سرزد ہوئے اور جن کی مشابہت بدرجۂ اتم ابن سبا سے منسوب اعمال کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ اور جن کی وجہ سے حضرت عمار یاسر کو ابن سبا خیال کر لینا قرین قیاس ہو سکتا ہے۔ ذیل میں سلسلہ وار درج کر کے بتا دینا چاہتے ہیں کہ یہی وہ امور ہیں جن کی مماثلت سے ابن سبا اور عمّار یاسر کو ایک ہی شخصیت سمجھ لیا گیا۔

(۱) — ابن سبا کا لقب ابن السوداء بھی تھا اور ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمّار کو بھی ابن السوداء کی کنیت سے یاد کیا جاتا ہے (فاضل مؤلف نے اپنی کتاب کے اوّل میں قریش کے ان تمام اقوال کو نقل کیا ہے جن کی بنا پر عمار یاسر کو ابن السوداء کے لقب سے اُن کا پکارنا ثابت ہوتا ہے)۔

(۲) — حضرت عمار کا باپ یمن سے تھا اور سبا کے لوگوں میں سے تھا۔ اور یہ

تو ثابت ہی ہے کہ ہر یمنی کو سبا کہا جاتا تھا، کیونکہ یمن کے تمام باشندے سبا بن یشحب بن یعرب بن قحطان کی اولاد میں سے تھے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں بھی بذیلِ تذکرہ حضرت سلیمانؑ یہ لکھا ہے کہ "ہُدہُد پرندے نے حضرت سلیمانؑ کو کہا کہ میں سبا سے آیا ہوں"۔ حالانکہ اس کا مقصد یمن سے تھا۔

(۳) — حضرت عمار بن یاسر فوق العادت طور پر حضرت امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے ہواخواہوں میں سے تھے اور ہر طریقہ سے چاہتے تھے کہ لوگ امیر المؤمنینؑ کی بیعت پر اتفاق کرلیں۔ چنانچہ اسی بنا پر وہ ہر ایک کو جناب امیر المؤمنینؑ کی طرف دعوتِ بیعت دیا کرتے۔

(۴) — شہاب الدین آلوسی بغدادی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ "ایک شخص حضرت عمار یاسر کی خدمت میں حاضر ہوا اور آیۂ مبارکہ " واذا وقع القول علیھم اخرجنا لھم دابۃ من الارض تکلمھم" کی تفسیر دریافت کی۔ حضرت عمار نے کہا کہ دابۃ الارض سے مراد علیؑ ابن ابی طالب ہے"۔

(روح المعانی جلد ۶ صـ ۳۱۲)

حضرت عمار یاسر کا یہ قول عبداللہ بن سبا کے اس منسوب قول کی مثل ہے کہ وہ یعنی ابنِ سبا رجعتِ علیؑ کا قائل تھا۔

(۵) — حضرت عمار یاسر عثمان کے زمانۂ خلافت میں مصر پہنچا اور وہاں جا کر لوگوں کو عثمان کے خلاف مشتعل کیا۔ گورنرِ مصر نے مزاحمت کی اور چاہا کہ عمار کو قتل کر دے۔ (الفتنۃ الکبریٰ جلد اول صـ ۱۲۸ طٰہٰ حسین)

یہ خبر بھی ابنِ سبا کے حالات سے ملتی جلتی ہے کیونکہ اس کے بارے میں بھی مورخین نے بیان کیا ہے کہ عبداللہ بن سبا نے اپنا مرکزِ تبلیغ مصر کو قرار دیا تھا اور فسطاط میں مقیم رہا۔

(۶) —— ابنِ سباء کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ علانیہ لوگوں کو مخاطب کر کے کہا کرتا تھا کہ عثمان خلافت کے بارے میں غاصب ہے۔ اور اصل میں یہ حق علیؑ ابن ابی طالب کا ہے۔ ابنِ سباء کا یہ اظہار سو بہو عمار یاسر کے عقیدہ کے مطابق ہے۔ کیونکہ حضرت عمار نے بھی بیعتِ عثمان کے سلسلہ میں مسجدِ نبوی میں اس قسم کی تقریر کی تھی اور علانیہ لوگوں کو کہا تھا کہ اے قریش! خلافت امیر المومنینؑ علی ابنِ ابی طالب کا حق ہے اور تم نے امرِ خلافت کو پیغمبرؐ کے خاندان سے خارج کر دیا ہے۔ تم کبھی کسی کو خلیفہ بناتے ہو اور کبھی کسی کو اس سلسلہ میں مجھے یہ بھی گمان ہے کہ امرِ خلافت کو خدا تم سے اسی طرح لے کر غیر کو دے دیگا جس طرح تم نے اہل بیتِ رسالت سے امرِ خلافت کو لے لیا اور غیر مستحق کے حوالے کر دیا۔"

(کتاب اہل البیت تألیف عبدالحمید جودۃ السحار مصری ص ۶۶)

(۷) —— یہ بھی کہا جاتا ہے کہ واقعۂ جمل میں عبداللہ بن سبا نے اہم پارٹ ادا کیا تھا وہ اس طرح کہ جب فریقین کی صلح ہونے لگی تو اسی ابن سبا نے خفیہ سازشوں سے صلح کو جنگ کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ جس شخص نے جنگِ بصرہ کے تفصیلی حالات کو بغور پڑھا ہے اُسے علم ہے کہ حضرت عمارؓ نے حضرت علیؑ کی طرفداری میں اس جنگ میں کوئی دقیقہ بھی فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ اور یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ حضرت عمارؓ نے امام حسنؑ اور مالکؓ اشتر کے ساتھ کوفہ میں جا کر تقریروں کے ذریعہ امامِ حق کی بیعت اور مخالفین کے ساتھ لڑنے کی ترغیب دیکر امیر المومنینؑ کی فوج میں کافی اضافہ کیا تھا۔

(۸) —— مورخین و افسانہ تراشوں نے یہاں تک بھی لکھا ہے کہ ابن سبا نے ہی

حضرت ابوذر غفاریؓ ایسے جلیل القدر صحابیِ رسولؐ اشتراکیت کی تعلیم دی تھی جہاں تک ابوذر و عمار یاسر کے روابطِ باہمی کا تعلق ہے وہ بیشک مضبوط تھے ان دونوں حضرات میں عقیدے کی یگانگت اور ایک مکتبِ فکر کے ساتھ انسلاک بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت اپنے مقام پر واضح ہے کہ یہ دونوں بزرگوار حضرت امیرالمومنین علیہ السّلام کے ساتھ سیاسی و مذہبی مؤقف کے اعتبار سے ضرور وابستہ تھے۔ مگر حضرت ابوذر اس امر کے محتاج نہ تھے کہ ابن سبا ان کو یہ سکھلائے کہ خراجِ مسلمین کو مالِ خدا کہا جائے۔ اس سلسلہ میں اگر یہ کہا جائے کہ اس قسم کی تعلیمات حضرت علیؑ و عمارؓ نے ابوذرؓ کو سکھائی تھیں تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔

مندرجۂ بالا آٹھ عنوانوں میں جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے یہ سب تاریخی حقائق ہیں نتیجہ کے طور پر ان مندرجات سے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ ان تمام امور میں حضرت عمار یاسرؓ اور ابن سبا کے حالات میں بدرجۂ اتم مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے اگر ہم یہ کہہ دیں کہ ابن سبا یعنی ابن السودا سوائے عمار یاسر کے کوئی اور دوسرا شخص نہیں ہے تو حقیقت ہوگی۔ کیونکہ قریش فتنہ و فساد کے واقعات میں (جو مخالفتِ عثمان کے سلسلہ میں صورت پذیر ہوئے تھے) حضرت عمار یاسر کو کافی حد تک دخیل خیال کرتے تھے۔ بلکہ اس تمام شورش کا بانی مبانی حضرت عمار کو ہی سمجھتے تھے۔

اوّل اوّل تو یہ لوگ حضرت عمار کا نام ابن سبا کے عنوان سے نہیں لیتے تھے کیونکہ اس بزرگ صحابیِ رسولؐ کی دینی منزلت اور اسلامی وجاہت ان کے ارادوں میں مانع تھی۔ مگر پھر بھی وہ اپنی خصوصی مجالس میں رمز و اشارے کے طور پر عمار یاسر کو ابن السودا کے لقب سے ضرور یاد کیا کرتے تھے۔ اب جب رواۃ و ناقلینِ اخبار نے ان حالات کو سُنا تو بغیر اس کے وہ قریش کے رمز و کنایہ کو سمجھیں ابن السودا کو

عمار یاسر سے ایک الگ شخصیت خیال کرلیا۔ اور یہ تحقیق نہ کی کہ قریش کے ان اقوال و حکایات کا پس منظر کیا ہے۔ چنانچہ جیسا سُنا ایسا ہی منتشر کر دیا۔

(ملخص کتاب نقش وعاظ در اسلام فصل ۷ صفحات ۲۱۲ - ۲۱۳ - ۲۱۴ - ۲۱۶ - ۲۱۷ مولفہ ڈاکٹر علی الوردی پروفیسر بغداد یونیورسٹی ماخوذ از مکتب تشیع علامہ محمد حسین الطباطبائی مطبوعہ قم (ایران) ص۳۱۸ ص۳۲۱)

شیعی فاضل استاذ علامہ الطباطبائی کا اعتراف

استاد علامہ آقائی حاج سید محمد حسین طباطبائی تبریزی عہدِ حاضر میں ایران و عراق کے مشاہیر اور مقتدر شیعی علماء میں سے ہیں۔ اور علومِ فقہ۔ اصول۔ تفسیر۔ فلسفہ وغیرہ میں کافی دستگاہ رکھتے ہیں۔ ان کے شیوخ و اساتذہ آقا سیّد ابوالحسن اصفہانی آیۃ اللہ نائینی۔ شیخ محمد حسین اصفہانی وغیرہ متبحر شیعہ علماء و مجتہدین ہیں۔ فاضل طباطبائی کا ان بزرگوں سے شرفِ تلمذ ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ خود علمی طور پر بلند مقام پر فائز ہیں۔ آجکل حوزہ علمیہ قم (ایران) میں علومِ محمدؐ و آلِ محمد علیہم السّلام کی نشر و اشاعت اور درس و تدریس میں مشغول ہیں اور سینکڑوں فضلاء ان کے چشمۂ دانش سے سیراب ہو رہے ہیں۔ باوجود درس و تدریس وغیرہ اہم مشاغل کے تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع کر رکھا ہے۔ اس سلسلہ میں اُن کی تفسیر "المیزان فی تفسیر القرآن" (عربی) جو پچیس ۲۵ جلدوں تک ختم ہوتی ہے اور ہر جلد کم و بیش چار صد پچاس صفحات پر مشتمل ہے موجودہ دور میں گرانقدر علمی شاہکار ہے۔ اس تفسیر کی آٹھ جلدیں ابھی تک طبع ہوئی ہیں۔ اور باقی غیر مطبوع ہیں۔ اس کے علاوہ اصول فلسفہ۔ حاشیہ مکاسب۔ حاشیہ کفایۃ الاصول۔ حاشیہ اسفار ملا صدرا۔ اور بعض دیگر علمی رسائل بھی ان کے اہم

تالیفات سے ہیں جن میں کچھ تو چھپ چکے ہیں اور کچھ ابھی تک طبع نہیں ہوئے۔ خدا کرے یہ سارا علمی سرمایہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر جلدی قدر دانوں کے پاس پہنچے۔

فاضل علامہ باایں ہمہ کثرتِ مشاغلِ علمیہ ایک سہ ماہی مجلۂ علمیہ کے سرپرست بھی ہیں جس کا نام "مکتبِ تشیع" ہے۔ اس مجلہ کا ہر سال ایک خاص اور ضخیم نمبر شائع ہوتا ہے جس میں مختلف علمی موضوعات پر فاضل علامہ کے قلم سے بحث ہوتی ہے۔

پہلا خاص نمبر تو ہم تک نہیں پہنچ سکا مگر دوسرا سالنامہ بتوسط جناب حجۃ الاسلام مولینا محمد حسین صاحب قبلہ پرنسپل مدرسہ محمدیہ سرگودھا جو عراق سے ابھی ابھی فارغ التحصیل ہو کر تشریف لائے ہیں ہمیں موصول ہو چکا ہے۔ اس علمی ذخیرہ میں شیعی مکتبِ فکر کا کافی حد تک تعارف کرایا گیا ہے اور فاضل استاد علامہ طباطبائی کے وہ علمی مذاکرات جو فرانسیسی مفکر پروفیسر ہانری کربن کے ساتھ ہوئے ہیں ان کو اس رسالہ میں بغرضِ استفادۂ عام شائع کیا گیا ہے اور اس موضوع و علمی دستاویز کی اہمیت کے پیشِ نظر اس سالنامہ کو انگریزی۔ فرانسیسی۔ عربی اور فارسی ہر چہار زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ خداوندِ عالم ہمیں توفیق دے کہ ہم اس کا اردو عکس بھی شائع کر سکیں۔

چنانچہ ان علمی مباحث کے باب توضیحات میں "عبداللہ بن سبا" کے عنوان پر بھی بحث کی گئی ہے اور ہماری پیشِ نظر تالیف کے موضوع کے مطابق یہ ثابت کیا گیا ہے کہ عبداللہ بن سبا کی ساری داستان بنی بنائی ہے۔ ہم نے بھی ان مندرجات سے کافی استفادہ کیا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم ان مباحث کا خلاصہ اپنی اس کتاب میں ناظرین کے سامنے پیش نہ کرتے تو ہماری تالیف کسی حد تک تشنۂ تکمیل رہ جاتی۔

عبداللہ بن سبا کے عدمِ وجود پر بحث کرتے ہوئے علامہ طباطبائی نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری۔ مرتضیٰ عسکری نجف۔ پروفیسر علی الوردی بغداد۔ علامہ شیخ محمد حسین

آل کاشف الغطاء اور استاد علامہ عبداللہ سبیتی (عراق) کے نظریات و بیانات کے اقتباسات کو بھی پیش کیا اور اپنی تحقیقات کا خلاصہ ذیل کے الفاظ میں تحریر فرمایا ہے :-

" ابن سبا اور سبائیین کی داستان کے متعلق مورخین و تذکرہ نویسوں نے قریباً ہزار سال سے بہت کچھ لکھا ہے۔ اور ایسے ایسے افکار و نظریات اور عقائد وغیرہ کو اُن سے نسبت دی ہے کہ بقول ڈاکٹر علی الوردی مصنفِ کتاب "وعاظ السلاطین" تمام جہان کے گناہوں کو ابن سبا اور اس کے نام نہاد متبعین کی گردن میں ڈال دیا گیا ہے۔ قبل اس کے کہ خود ابن سبا کے وجود کے بارے میں ہی تحقیق کرلی جاتی ان تذکرہ نویسوں کے تالیفات میں اگر نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس عہدِ قریب کے دو صد سال کے عرصہ میں کوئی ایسی کتاب جو تاریخِ اسلام و سِیَرِ صحابہ کے عنوان سے لکھی گئی ہے نہیں ملیگی۔ مگر یہ کہ اس میں ابن سبا وغیرہ کے فرضی قصوں کا وجود نہ پایا جاتا ہو۔ ہم اس مقام پر بطورِ اجمال قرونِ گذشتہ اور عصرِ حاضر کے مورخین و مؤلفین کے وہ بیانات جو افکار و عقائد کے سلسلہ میں ابن سبا اور سبائیین وغیرہ سے منسوب کئے گئے ہیں نقل کرتے ہیں اور اس کے بعد مختصر طور پر اس داستان سرائی کا تاریخی تجزیہ اور ابن سبا کے فرضی وجود پر تاریخ و درایت کی روشنی میں بحث کریں گے "

اس بیان کے بعد فاضل علامہ نے مورخین و مصنفین کے اُن وحشت خیز بیانات کو قلمبند کیا ہے جو ابن سبا وغیرہ کے متعلق بیان کئے جاتے ہیں۔ ہم تکرار کے خیال سے ان بیانات کو یہاں نقل کرنے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ اس تالیف کے ابتدائی صفحات میں ان کو تفصیلاً لکھا جا چکا ہے۔

اس سلسلہ میں قریباً سولہ سترہ عنوانات کے تحت فاضل مذکور نے ان تمام

ہولناک باتوں اور مورخین کے خرافات کو پیش کر کے شیعہ سنی محققین کے اقتباسات کو اپنی بحث کی تائید میں تردیداً نقل فرمایا ہے۔ اور جن کو ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ آخر کلام میں فاضل علامہ کے اپنے الفاظ اس طرح ہیں :-

"آیا عبداللہ بن سبا کوئی شخصیت تھی یا یہ محض وہمی چیز ہے؟ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب پورے غور و خوض اور کامل تحقیقات کے بعد قطع نظر شیعی خیالات کے خود اہلِ تسنن کے بعض فضلائے عصر نے نہایت وثوق اور اطمینان سے دیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قصۂ ابن سبا اور اس کے متعلق بے سروپا کہانیاں شیعوں کے مخالفین نے وضع کی ہیں۔ اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ یہاں تک کہ جلیل القدر صحابۂ رسول کو بھی ابن سبا کی تبلیغات کا مرکز قرار دیدیا گیا۔

ہم اس مقام پر طول طویل بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے۔ صرف مختصر طور پر عرض کر دینا ضروری ہے کہ جو کچھ اس سلسلہ میں عصر حاضر کے محققین کی تحریرات سے ہم تک پہنچا ہے وہ نتیجہ کے طور پر فقط اتنا ہی ہے کہ ابن سبا کا وجود کبھی تھا ہی نہیں۔ یہ صرف دعویٰ ہی نہیں بلکہ اس بحث میں تاریخی تجزیہ کرنے والوں نے کافی دلائل مہیا کئے ہیں۔ جن میں سے کچھ تو ہم اپنی بحث میں پیش کر چکے ہیں اور مزید تفصیلات کو کسی دوسرے وقت کے لئے اٹھا رکھا ہے۔" (رسالہ مکتب تشیع فارسی سالانہ نمبر جلد دوم صفحہ ۱۹۴-۲۰۸ مطبوعہ قم ایران) مؤلفہ علامہ سید محمد حسین طباطبائی صاحب تفسیر المیزان)

آیت اللہ آل کاشف الغطاء کا کیا خیال ہے؟

حوزۂ علمیہ نجف کے نامور محقق علامہ شیخ محمد آل کاشف الغطاء اعلی اللہ مقامہ کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ یہ وہ بلند شخصیت ہے کہ جس کی علمی تحقیقات کا

لو ہا مصری دنیا بھی تسلیم کر چکی ہے۔ ان کے علمی جواہر پارے عالم اسلام اور خصوصاً شیعی دنیا کے لئے اہم مصادر ہیں۔ شیعی مؤقف اور امامیہ مکتب فکر کے تعارف کے سلسلہ میں ان کی مختصر مگر جامع تالیف "اصل الشیعۃ و اصولہا" شیعہ، سنی اور مستشرقین یورپ سے بھی خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اور اس کا ترجمۂ اردو رضا کار بکڈپو لاہور کے اہتمام سے معیاری طباعت کے ساتھ پاکستان میں شائع ہو چکا ہے۔ اور ایران میں فارسی ترجمہ بھی طبع ہو چکا ہے۔

چنانچہ اس اپنی تالیف کے ابتدائی صفحات میں شیخ مرحوم ایک مقام پر احمد امین مصری صاحبِ فجر الاسلام کا علمی تعاقب کرتے ہوئے عبد اللہ بن سبا کی داستان کے متعلق لکھتے ہیں :-

" اس سلسلہ میں بعض حضرات کی یہ رائے ہے کہ عبد اللہ بن سبا مجنون عامری اور ابو ہلال وغیرہ داستان سراؤں کے خیالی ہیرو ہیں۔ اموی اور عباسی سلطنتوں کے وسطی دور میں عیش و عشرت اور لہو و لعب کو اتنا فروغ حاصل ہو گیا تھا کہ فسانہ گوئی محل نشینوں اور آرام طلبوں کا جزوِ زندگی بن گئی تھی۔ چنانچہ اس قسم کی کہانیاں بھی ڈھل گئیں "

(کتاب اصل الشیعہ واصولہا (عربی) ص ۵۷/۵۸ طبع ہشتم۔ فارسی ترجمہ ص ۶۵ ترجمۂ اردو اصل و اصولِ شیعہ ص ۱۲)

فاضل جلیل مدیرِ اصلاح کی تحقیقات

ادارۂ اصلاح کھجوہ ضلع سارن (انڈیا) کے علمی اور مذہبی خدمات کا سلسلہ خدا کے فضل سے اس گئے گزرے زمانہ میں بھی بدستور جاری ہے۔ اور یہ سلسلہ اس علمی خانوادہ کا اس وقت سے جاری ہے جبکہ ہندوستان میں شیعیت اپنے ابتدائی دور میں تھی۔ اس

خاندان کے دفاعی خدمات اور تبلیغی نقوش آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ فاضل اجل مولانا سید محمد باقر نقوی صدر الافاضل مدیر اصلاح کھجوہ اپنے آبا و اجداد کی طرح بحمداللہ ان خدمات کو بدستور جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان دیگر اہم تالیفات کے علاوہ موجودہ روشنی کے دور میں سوانحِ عمری حضرت امیر المومنینؑ ایک بہت بلند علمی شاہکار ہے، جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے اور سلسلۂ تحریر ابھی تک جاری ہے۔ خداوندِ عالم انھیں مزید توفیقات عطا فرمائے۔

پچھلے دنوں محمود عباسی نے جب "خلافتِ معاویہ و یزید" نامی کتاب شائع کی تو فاضلِ مذکور نے نہایت عجلت کے ساتھ اس کا جواب "اموی دورِ خلافت" کے نام سے شائع کر دیا۔ اس جوابی کتاب میں جہاں محمود عباسی کے دیگر خرافات کا جواب دیا گیا، وہاں ابنِ سبا، اور سبائیین کے متعلق بھی یہ ثابت کر کے دکھایا گیا کہ یہ داستان سرتاپا فرضی اور من گھڑت ہے۔ اس سلسلہ میں فاضل ہم عصر نے ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب "الفتنۃ الکبریٰ" اور علامہ مرتضیٰ عسکری نجف عراق کی تالیف "عبداللہ بن سبا" ہر دو کتابوں کو ہی اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔ اور ایک مستقل عنوان کے تحت ان ہر دو مفکرین کے مندرجات کو پیش کر کے ابن سبا کے عدمِ وجود پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ ہم نے اپنی پیشِ نظر تالیف میں اکثر و بیشتر مقامات پر "اموی دورِ خلافت" کو ہی سامنے رکھا ہے۔

چنانچہ فاضل مذکور اپنی بحث کے خلاصہ کو ایک مقام پر اس طرح لکھتے ہیں:۔

"حقیقت یہ ہے کہ ابن سبا نام کا کوئی شخص تاریخ اسلام میں گذرا ہی نہیں۔ یہ ساری مصیبت سیف بن عمر ایک راوی کی ہے جس نے ابن سبا تو ابن سبا بہت سے ایسے فرضی صحابی بنا لئے ہیں اور ان کے نام سے فرضی روایتیں بیان کی ہیں جو کبھی پیدا ہی نہیں ہوئے

تھے۔ بلا استثناء تمام مورخین نے خواہ وہ عرب کے ہوں یا عجم کے، یا یورپ کے مستشرقین، سبھی نے ابن سبا کے قصہ کو طبری سے نقل کیا ہے اور طبری نے سری ایک شخص سے معلوم کیا اور سری نے سیف ابن عمر سے۔ سیف ابن عمر ہی نے اس قصہ کو بیان کیا اور اسی نے شہرت دی۔

سیف ابن عمر زمانۂ ہارون الرشید میں ۱۷۰ھ میں مرا۔ اس سے پہلے جتنے راوی تھے کسی نے بھی ابن سبا کا نام تک نہیں لیا۔ اور طبری کے پہلے جو کتابیں تصنیف ہوئیں ان میں ابن سبا کا ذکر تک نہیں۔ طبری کے بعد اکثر مورخین نے اس قصہ کو سلسلۂ اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اور بلاواسطہ یا بالواسطہ طبری تک سلسلۂ اسناد کو منتہی کیا ہے۔ کچھ مورخین ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنی کتابوں میں اس قصہ کو بغیر سند یا بغیر حوالہ لکھا ہے لیکن کتاب کے شروع یا آخر میں مصادرِ کتاب کی فہرست میں طبری کا نام لکھا ہے یا اُن کتابوں کے نام کی صراحت ہے جو طبری سے لکھی گئیں۔

ان تمام باتوں سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ طبری ہی سے ابن سبا کے اس قصہ کی بنیاد پڑی۔ سب سے پہلے اُنہیں نے اپنی کتاب میں اس قصہ کو لکھا اور بعد میں آنے والے مورخین نے ان پر حیرت انگیز حد تک اعتماد و وثوق کرتے ہوئے آنکھ بند کر کے اِس قصہ کو اپنی کتابوں میں نقل کر دیا۔" (کتاب اموی دورِ خلافت ص ۲۰۶ مؤلفہ سیّد محمّد باقر نقوی مدیر اصلاح کھجوہ مطبوعہ لکھنؤ (انڈیا)۔)

شیعہ کتبِ رجال اور ابن سبا

شیعوں کے مخالفین نے جو تہمتیں اور الزام تراشیاں مذہب شیعہ پر عائد کیں وہ کوئی ایک دو نہیں۔ بلکہ ہم اگر ان کو جمع کریں تو ایک مستقل تالیف کی ضرورت ہو گی۔ خاندانِ رسالت اور ان سے وابستہ افراد کی دینی پوزیشن اور ان کے طرزِ معاشرت کو داغدار اور بھیانک صورت میں دکھانے کے لئے جو کچھ کیا گیا وہ تاریخ کا ایک مستقل باب ہے۔ عقدِ اُمِ کلثوم اور تعددِ بناتِ رسولؐ وغیرہ ایسے مسائل بطورِ مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ان خلافِ عقل و نقل واقعات کو اتنی ہمہ گیر شہرت دی گئی اور تاریخ میں نہایت چالاکی سے مربوط کر دیا گیا کہ بعض شیعہ مورخین و مصنفین بھی مرعوب ہو گئے اور اپنے اپنے مصنفات میں جگہ دیدی۔ اور یہ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ مخالفین نے تو تعصب برتا، مگر بعض شیعہ بھی غیر شعوری طور پر ان باتوں کو لکھ بیٹھے۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی اپنے مقام پر مسلّم ہے کہ ایک دو سو سال کے عرصہ میں مختلف اقوام کے مؤلفین اور سیرت نگاروں نے بھی اسلامی تاریخ کو ہی جولانگاہ بنایا اور شیعہ سنّی نظریات کو اپنی طرف سے رنگ دیکر خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ خصوصاً استعماری طاقتیں اس سلسلہ میں پیش پیش تھیں۔ کیونکہ ان کا تو مقصد ہی صرف یہ تھا کہ مسلمان قوم کی یکجہتی اور یگانگت پارہ پارہ ہو جائے بغیر واقعات کی چھان بین اور حقیقت رسی کے جن شیعہ مؤلفین اور ائمہ رجال نے ابن سبا کے وجود کو لکھا ہے ہم ان کو معذور خیال کرتے ہیں۔ کیونکہ جس ماحول میں ابن سبا اور شیعیت کی مخالفت کی داستانوں اور قصوں کو اعتبار کے قالب میں ڈھالا جا رہا ہو، تاریخ و روایت کی تدوین اسلامی حکومتیں اپنے زیرِ اثر مدون کروا رہی ہوں اور زر و مال اور قہر و غلبہ سے ان بے سر و پا واقعات کو پروان چڑھایا جا رہا ہو تو وہاں کسی شیعہ کا برملا انکار کرنا اور نہ ماننا "طوطی کی آواز نقار خانے میں" کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے۔

بہرحال یہ ضرور ہے کہ شیعہ علمائے رجال نے بھی ابنِ سبا کے وجود کو اپنی کتابوں میں لکھا، مگر پھر بھی اس طرح نہیں جیسا کہ ان کے مخالفین نے مبالغہ کے ساتھ تمام شیعی عقائد کو ابنِ سبا کی طرف منسوب کیا۔ اور حضرت عثمان کے خلاف تمام فتنہ و فساد کے واقعات کو اس موہوم شخصیت کے سر تھوپا۔

ہم ذیل میں چند ایک شیعی تصریحات ابنِ سبا کے متعلق جو مقتدر علمائے رجال نے پیش کی ہیں درج کر کے واضح کرتے ہیں کہ عبداللہ بن سبا کا وجودِ خارجی بالفرض اگر ہو، یا وہ محض عالمِ خیال اور افسانہ تراشی کا عنوان ہی ہو جیسا کہ سابقہ توضیحات میں ہم نے ثابت کیا ہے۔ پھر بھی یہ بات کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ابنِ سبا کے غالیانہ اور کفر و زندقہ سے ملے جلے افکار و عقائد کو شیعیت سے تعبیر کرنا شیعوں کے مخالفین کی ایک زبردست جسارت ہے۔ ہم شیعی معتقدات کے ضمن میں یہ ثابت کر چکے ہیں کہ شیعوں کے اعتقادات کوئی اسلام کے متضاد نظریات نہیں ہیں بلکہ شیعیت ہی عینِ اسلام ہے۔ اور شیعہ اسلام کا دوسرا نام ہے۔ جس طرح ابن سبا اور سبائیین کو غلو کے مقام پر بیان کیا جاتا ہے شیعہ اُس سے قطعی طور پر بیزار ہیں اور واشگاف الفاظ میں چیلنج کرتے ہیں کہ شیعیت کا سبائی غلاۃ سے ذرہ بھر بھی واسطہ نہیں۔ غالیوں کے جن عقائد کو شیعوں سے نسبت دی جاتی ہے وہ سب کی سب شیعہ محققین کے نزدیک لغو اور باطل ہیں، اور تمام شیعہ علمائے کرام قطعی طور پر ابن سبا اور سبائی عقائد سے بیزار ہیں۔ چنانچہ شیعی مکتبِ فکر کے عظیم دانشمند علامہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء اعلی اللہ مقامہ ارشاد فرماتے ہیں:۔

"عبداللہ بن سبا کہ اس کو شیعہ اور شیعہ کو اس کے ساتھ چسپاں کیا جاتا ہے۔ شیعہ کی تمام موجودہ کتب اس بات پر شاہد ہیں کہ ابن سبا غالی اور ملعون تھا اور تمام شیعہ علماء نے اس پر لعنت کی صراحت

کی ہے اور اس کے خیالات سے بیزاری اختیار کی ہے۔ ہلکی سے ہلکی عبارت جو شیعہ علمائے رجال نے اس کے بارے میں تحریر کی ہے وہ یہ ہے کہ "ان عبد اللہ بن سبا" العن من ان یذکر" (عبد اللہ بن سبائ ایسا ملعون ہے کہ اس کا ذکر بھی کیا جائے۔)"

(اصل اصول شیعہ عربی ص۵۷ طبع نجف)

شیخ مرحوم کے علاوہ متقدمین میں سے سرکار علامہ حلی اعلی اللہ مقامہ نے حسب ذیل الفاظ سے ابن سبا کو تحریر کیا ہے:۔

"عبد اللہ بن سبا رغالی ملعون ہے۔ امیر المومنینؑ نے اُسے آگ میں جلا دیا تھا اور اس کا یہ عقیدہ تھا کہ علی خدا ہے اور وہ خود نبی ہے۔ خدا اس پر لعنت کرے۔" (کتاب تاریخ الشیعہ ڈاکٹر حسین علی ص۹)

نیز یہی عبارت محمد بن علی الاردبیلی نے اپنی کتاب جامع الرواۃ جلد ا صفحہ ۴۸۵ طبع اول میں لکھی ہے۔ اور خاتم المحدثین شیخ عباس قمی نے بھی تحفۃ الاحباب صفحہ ۱۸۴ مطبوعہ طہران میں بذیل تذکرہ عبد اللہ بن سبا تحریر کی ہے۔

غرضیکہ متقدمین ہوں یا متاخرین، سب شیعہ علماء نے ابن سبا کو انہیں الفاظ سے یاد کیا ہے۔ قطع نظر شیعہ علماء کے بیانات کے اگر خود جمہور مسلمین کے علماء کی تحقیقات پر نگاہ ڈالی جائے اور سابقہ قرون و اعصار کے تمام تاریخی ذخیرہ کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ جن لوگوں نے ابن سبا کے وجود کو تسلیم کیا ہے انھوں نے ساتھ ہی اس بات کی بھی تصریح کر دی ہے کہ عبد اللہ بن سبا کے غالیانہ عقائد اور وحشت خیز نظریات کی تردید خود امیر المومنین علیہ السلام نے اور ان کی اولاد امجاد اور ان کے شیعوں نے بھی عملی طور پر کی۔ جیسا کہ فرانسیسی مورخ پروفیسر گویار داپنی کتاب میں اسلامی فرقوں کی تقسیم بندی کے ذیل میں شیعی مسلک کا تعارف کراتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"حضرت علیؑ کے زمانہ میں عبداللہ بن سبا نام کا ایک شخص جو پہلے یہودی تھا مسلمان ہوا۔ اُس نے دامادِ پیغمبرؐ حضرت علی علیہ السّلام کے بارے میں الوہیت کا دعویٰ کیا۔ مگر اس قسم کے عقائد کی تردید فوراً ہی حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کی طرف سے ہوئی حتیٰ کہ خود اُن کے مخلص شیعوں نے بھی عبداللہ بن سبا کو مردود قرار دیا۔"

(کتاب سازندگانِ تمدن امپراطوری اسلام ترجمہ فارسی ص ۳۸ مطبوعہ طہران)

بہر حال یہ ثابت ہو چکا کہ اگر ابنِ سبا کا کوئی وجود تھا تو وہ غالی تھا جس کا شیعیت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں شیعوں کے شدید ترین مخالفین بھی جہاں اس کا ذکر کرتے ہیں وہ بھی لکھتے ہیں کہ ابن سبا ملعون غالیوں کا سرغنہ تھا۔

اس مقام پر یہ ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علمائے شیعہ نے قطع نظر اس کے کہ ابن سبا غالی تھا یا کوئی اور اپنی تمام تالیفات میں غالیوں کو نجس اور خارج از اسلام تحریر کیا ہے۔ چنانچہ جناب شیخ مفید علیہ الرحمۃ جو بزرگ ترین فقہائے شیعہ میں سے ہیں، شرح عقائدِ صدوق میں لکھتے ہیں:۔

"غالی وہ لوگ ہیں جو امیرالمومنینؑ اور ائمہ طہار کی نسبت الوہیت و نبوّت کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کے بارے میں حد سے تجاوز کر جاتے ہیں۔ ائمہ علیہم السّلام نے ایسے افراد کے بارے میں حکم فرمایا ہے کہ یہ لوگ دینِ اسلام سے خارج ہیں۔" (شرح عقائد صدوق مطبوعہ تبریز ص ۶۳)

اس کے علاوہ تمام شیعہ فقہاء کے عملیات، مثلاً مصباح الفقیہہ۔ عروۃ الوثقیٰ اور مستمسک العروہ وغیرہ کو دیکھ کر اطمینان حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ان تمام تصریحات کے بعد بھی اگر کوئی شخص شیعیت کو سبائیت اور شیعوں کو غالیوں کے عنوان سے یاد کرے تو ہم اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ شخص دیدہ و دل کور ہے۔

پیشوایانِ دین و رہبرانِ اسلام کے بارے میں غلو اور غالیانہ امور کی نسبت فقط شیعہ جہّال کی طرف ہی نہیں۔ اس سلسلہ میں خود مخالفین شیعہ کے مذہبی و تاریخی لٹریچر میں بھی غلو آمیز داستانیں اور عقائدِ امیرِ شام معاویہ بن ابوسفیان اور دیگر بنو امیّہ کے بارے میں موجود ہیں، جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غلو کا اختصاص اور انتساب فقط شیعہ کے ساتھ ہی نہیں بلکہ اموی مسلک کے پابند حضرات بھی اس میں برابر کے شریک ہیں۔ اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ بھی اموییت کے حامل نہیں۔

ان تمام قصص و حکایات اور غلو آمیز داستانوں کو علّامہ امینی تبریزی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "الغدیر" جلد ۱۱ صفحہ ۱۰۳ تا ۱۹۳ میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے اور مسلمانوں کے معتبر مدارک سے نقل فرمایا ہے۔

بہر نوع، یہ بات تو ثابت ہو چکی کہ ابن سبا اور سبائین بالفرض اگر تھے بھی تو غالی تھے، جن کا اسلام سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ جیسا کہ شیعہ علماء کی تصریحات سے پیش کیا جا چکا ہے۔ مگر ہمارا اپنا مؤقف بدستور قائم ہے کہ ابنِ سبا اور سبائی گروہ کا وجود بالکل نہیں تھا اور یہ سب افسانے فرضی ہیں۔ اور زمانۂ حال میں تو ابن سبا کے وجود کو متفق الفریقین اور علم بین المحققین کہنا خلاف واقع اور کذب و افترا ہے۔ کیونکہ ہم نے اپنے مندرجات میں سات آٹھ شیعہ سُنّی محققین اہلِ علم کے متفقہ بیانات سے ثابت کر دیا ہے کہ ابنِ سبا ایک خیالی داستان کا ہیرو ہے۔

ابنِ سبا، اور ہم

تاریخِ اسلام کی یہ ایک اہم فروگذاشت ہے کہ اس نے قریباً آج سے ہزار برس قبل اپنے اوراق میں ایک ایسے باب کا اضافہ کیا جو نہ تو کسی مستند اساس پر قائم ہے اور نہ ہی صحیح تاریخ سے اس کا کوئی لگاؤ۔ یعنی عبداللہ بن سبا، کا فرضی قصّہ۔ کافی مدت سے بعض مورخین اس کو بیان کرتے چلے آرہے ہیں، اور آئے دن کوئی نہ کوئی شگوفہ اس میں بڑھا دیا جاتا ہے۔ متقدمین نے تو بعض سیاسی مصالح اور قرنِ اوّل کے مسلمانوں کی مذہبی و سیاسی فروگذاشتوں کو پردۂ خفا میں رکھنے کے لئے اس داستان کو بنایا۔ مگر بعد میں آنے والے مصنفین نے ابنِ سبا، کے متعلق یہ تمام قصّے حقیقت خیال کر لئے۔ مزید برآں بعض متکلمین نے ابنِ سبا، اور سبائی گروہ کی طرف ایسے اسلام سوز عقائد کی نسبت بھی دے دی کہ جن کا تعلق اسلام سے اور خصوصاً شیعیت سے قطعاً نہیں تھا۔ اور ان تمام باتوں سے غرض یہ تھی کہ شیعوں کو اسلامی معاشرہ سے نکال کر یہودیت میں شامل کرکے دکھایا جائے تاکہ شیعیت کے متعلق یہ مشہور ہو جائے کہ شیعہ ایک یہودی کے جھانسے میں آئے ہوئے تھے۔ اس کے بعد دانستہ یا غیر شعوری طور پر جو اہلِ قلم بھی اٹھا اس نے عبداللہ ابن سبا، کی کہانی کو ضرور موضوعِ بحث بنایا۔ اور اہلِ اسلام کی اہم مذہبی تنظیم جو شروع سے ہی دیگر مسلمانوں کے دوش بدوش چلی آرہی ہے پر ایسے ناروا حملے کئے کہ جن کو دیکھنے سے تہمت اور الزام تراشی بھی اپنے مقام پر شرمندہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ حالانکہ شیعی لٹریچر از قسم تفسیر۔ حدیث۔ تاریخ اور کلام وغیرہ بالکل ان خرافات سے پاک ہے۔ ذوقِ سلیم سے مطالعہ کرنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ جطرح دیگر مسلمان توحید و رسالت اور معاد یا ضروریاتِ دین و اسلام کا اعتقاد رکھتے ہیں اسی طرح یہ شیعہ بھی تمام اسلامی عقائد کو ان سے بڑھ چڑھ کر اپناتے ہیں۔ مگر شیعوں کے چند

ایک امتیازی عقائد جن پر وہ قرآن و حدیث سے برہان بھی رکھتے ہیں ایسے ہیں جو انھیں دوسرے اسلامی فرقوں سے ممتاز کرتے ہیں۔ یعنی مسئلۂ امامت اور عدل وغیرہ جس کا اجمالی تذکرہ ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ کیوں کیا جاتا ہے؟ اس لئے کہ بقول ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری جن کا تفصیلی تبصرہ ہم لکھ چکے ہیں شیعیت میں یہودیت کا عنصر داخل کر دیا جائے، اور حضرت عثمان یا ان کے عمال کے ناشائستہ اعمال و حرکات کو چھپا دیا جائے تاکہ لوگ ان کے بارے میں شبہات میں پڑ جائیں۔ مگر ان تمام امور کو وہی شخص باور کریگا جسے تاریخ و درایت سے شناسائی نہیں۔ یا پھر وہ شخص روایت پرستی کی اندھا دھند تقلید میں اس قدر کور ذوق ہو چکا ہے کہ وہ کسی شہرت یافتہ بات کے خلاف کچھ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مگر با ایں ہمہ تشدد پسند رویہ کے کچھ ایسے حقیقت پسند مصنف اور مورخ بھی ہیں جو تاریخ کو مورخانہ دیانتداری اور ہر واقعہ کو اس کے اصلی پس منظر کے ساتھ پیش کرنا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتے ہیں وہ بال کی کھال اتارنا جانتے ہیں اور تاریخ کو فلسفہ کی کسوٹی پر پرکھ کر اختلافات کی دلدل سے بآسانی نکل جاتے ہیں۔ وہ قلم اٹھاتے ہیں تو محض صداقت کے لئے اور لکھتے ہیں تو فقط تحقیق کی غرض سے۔ اس سلسلہ میں وہ اسلاف پرستی کے بندھنوں سے آزاد ہو کر واقعات کو عقل و نقل کی روشنی میں اور پوری چھان بین کے ساتھ دیکھ کر اپنا ایک نظریہ قائم کرتے ہیں۔ وہ اپنے عقائد و افکار کی اساس کو خیالی اور وہمی داستانوں پر استوار نہیں کرتے۔ مگر متاسفانہ طور پر ہمیں یہ کہنا پڑتا ہے کہ ایسے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ برخلاف ایسے لوگوں کے ایسے حضرات کی تعداد بہت زیادہ ہے جو محض لکیر کے فقیر ہوتے ہیں وہ پہلے ایک ہی چیز کو بطورِ عقیدہ محفوظ کر لیتے ہیں اور اس کے بعد واقعات و روایات کو اس اپنے عقیدے کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرنا ان کا کام ہوتا ہے۔ اس ضمن میں انھیں بہت سی کارروائیاں بھی کرنا پڑتی ہیں۔ صحیح عقائد کے مقابل وہ غلط سلط

تاویلوں سے کام لیتے ہیں، اور اگر اس طرح کچھ نہ بن پڑے تو من گھڑت افسانے۔ وضعی احادیث۔ مجہولہ روایات اور موہوم داستانیں ان کی امیدوں کا سہارا بنتی ہیں۔ ایسے ہی لوگوں نے "عبداللہ بن سبا" کا فرضی قصہ اپنے عقائد کو محفوظ کرنے کے لئے وضع کیا جس کے حقیقی پس منظر کو ہم سابق اوراق میں نہایت تفصیل کے طور پر محققین کے اعترافات کی روشنی میں بیان کر چکے ہیں اور یہ امر ثابت کیا جا چکا ہے کہ ابن سبا، اور اس کا طویل طویل قصّہ سیف بن عمر راوی کا وضع کردہ ہے۔ اور اس راوی سے فقط مورّخ طبری ہی نے نقل کیا۔ جس کو بعد کے لوگوں نے حقیقت سمجھ کر مشہور کرنے کی کوشش کی اور اپنی ذہنی بے راہ روی کی بنار پر آج جو شخص بھی اٹھتا ہے وہ ابنِ سبار کو مخاطب کرتے ہوئے یوں کہتا ہے:-

"اے عبداللہ بن سبار! تو اس فتنۂ عظیم کا بانی ہے۔ مسلمانوں کی تلوار تو کافروں پر چلتی ہے۔ مگر تو نے فریب اور سازش سے مسلمانوں پر ہی چلوائی۔ تو ان تمام فتنوں اور نقصانوں کا ذمّہ دار ہے جو حضرت عثمان کی مخالفت میں رُونما ہوئے۔ کیا یہ نقصان بھی کچھ کم ہے کہ اسلامی فتوحات یک قلم موقوف ہو گئے۔ تبلیغِ اسلام کا کام مدھم پڑ گیا۔ لیکن تو اپنے مقام پر خوش اور خندہ زیرِ لب ہے کہ تو نے وہ کام کر دکھایا جو اسلام کے ابتدائی ایام میں قریش مکّہ ایسے اربابِ طاقت بھی نہ کر سکے۔ کیا یہ تعجب کا مقام نہیں کہ تو نے ابوذر و عمّار یاسر ایسے جلیل القدر، دیا کباز صحابۂ رسولؐ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا اور اپنے مشن کی دستاویز اُن کے سپرد کر دی۔ یہ تیری ہی تو شخصیت ہے کہ تو نے کفر و الحاد کو اسلامی جماعت میں پھیلا کر ہزاروں کو گمراہ کر دیا اور اسلام نے جن باتوں کو مٹایا تھا تو نے از سر نو زندہ کر دیا۔ خاندانی اور نسلی

امتیاز پیدا کر کے مسلمانوں میں خانہ جنگی شروع کرادی۔ جن کی وجہ سے آج تک اسلامی فرقے گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ اور منافرت کی بیلیں پھیلتی ہی جارہی ہیں۔ المختصر ابن سبار!

بھلا کیا کہو گے جو پوچھے کوئی ✤ جہاں میں تم آئے تھے کیا کر چلے
فقط تیرا کہنا ہے اتنا ہی کافی ✤ قیامت کا فتنہ بپا کر چلے

چند اہم توضیحات اور نتائج بحث

توضیح اوّل قطع نظر ہماری سابقہ تصریحات کے بالفرض یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ ابن سبا، کا وجود کبھی تھا تو پھر بھی اس کو اتنی اہمیت حاصل نہ تھی جتنی کہ مورخین بیان کرتے ہیں۔ ان کے بیان کے مطابق وہ ایک نووارد شخصیت تھی جس نے یکسر اسلامی حکومت کا تختہ الٹ کے رکھ دیا۔ مورخین کی یہ زیادتی اور مبالغہ آرائی فقط اپنے حریفوں کو شکست دینے پر ہی موقوف نہیں رہتی بلکہ یہ تو صحابۂ کرام اور تابعین عظام پر بھی سخت بہتان اور افترا پردازی ہے۔ کیا کوئی شخص یہ باور کرسکتا ہے کہ صدرِ اسلام کے مسلمان جو شریعتِ اسلامیہ کے مخاطبِ اوّل اور حامل وحی سے بلا واسطہ استفادہ کرنے والے تھے وہ اتنے بھولے بھالے اور دینی وسیاسی بصیرت سے اس قدر بے بہرہ تھے کہ خارجی عوامل اور محرکات سے متاثر ہو کر کئی دیندار اور پاکباز مسلمانوں کا خون بے دریغ بہا ڈالا۔ ہمارا تو جی نہیں چاہتا کہ ایسے واقعات جن سے اولوالعزم شخصیتوں کی تذلیل ہوتی ہو تسلیم کریں۔ ہم تو صرف اسی بات کو حق سمجھتے ہیں جو اسلام کے صحیح ماخذوں سے ہم تک بذریعۂ ثقہ رواۃ پہنچی ہے اور ان سارے اختلافات اور واقعات کو اس وقت کے سیاسی مزاج کا ہی نتیجہ خیال کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے

کہ مسلمانوں کا کوئی مکتبِ خیال ان لغزشوں اور فروگذاشتوں کو جو اس وقت کے مسلمانوں سے وقوع پذیر ہوئیں خطائے اجتہادی کے عنوان سے تعبیر کرے، یا کوئی فرقہ ان باتوں کو اخروی و شرعی طور پر قابلِ مواخذہ سمجھے۔ بہرحال یہ بات اپنے مقام پر مسلّم ہے کہ ان مناقشات میں ابنِ سبا، وغیرہ کا رائی بھر بھی تعلق نہیں۔

توضیحِ دوم جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ مورخین نے ابنِ سبا کی کہانی کے ذیل میں اس کا اہم کردار یہ بتلایا ہے کہ وہ حضرت عثمان کا سخت مخالف تھا۔ اور جابجا حکومت پر تنقیدیں کرتا تھا۔ اور شرعی حیثیت سے حضرت عثمان کو وہ اس خیال کے تحت غاصبِ خلافت سمجھتا تھا کہ حکومت و خلافت حضرت علیؑ کا حق ہے۔ مورخین کے خیال کے مطابق ابنِ سبا کا یہی وہ بنیادی نظریہ ہے جس کی بناء پر اس کو شیعیت کا بانی خیال کیا گیا۔ تو میرے خیال میں یہ الزام شیعی لٹریچر سے ناواقفیت کی بناء پر ہے، ورنہ جو شخص امامیہ مذہب کے علم کلام سے تھوڑا بہت بھی واقف ہے اُسے بخوبی علم ہے کہ شیعہ لوگ حضرت عثمان کی نسبت حضراتِ شیخین یعنی ابوبکر و عمر کو اہلِ بیت کے معاملہ میں بہت زیادہ موردِ طعن قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک اہلِ بیتِ نبویؐ کے دینی و سیاسی تخالف میں حضراتِ شیخین کا سب سے زیادہ حصّہ ہے۔ اور حقیقت میں یہی دو بزرگوار ہیں جن کے اہم منصوبوں پر آئندہ چل کر عملدرآمد کیا گیا۔ تو اس سلسلہ میں ابنِ سبا، اگر شیعہ ہوتا یا شیعی عقائد کا بانی ہوتا تو شیعی نقطۂ نظر سے پہلے وہ حضرات ابوبکر و عمر کے دین و سیاست پر اعتراض کرتا اور ان کو غاصب سمجھتا، اور بعد میں حضرت عثمان وغیرہ کے حق میں لب کشائی کرتا۔ کیونکہ تمام مسلمانوں کے نزدیک خلافتِ شیخین اصل ہے اور خلافتِ عثمانیہ اس کی فرع، اور اصل کو چھوڑ کر فرع کو کیونکر موجبِ قدح قرار دیا جاسکتا ہے۔

توضیحِ سوم محدثینِ اسلام نے بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے جس فتنہ کے رونما ہونے کی خبر بطورِ پیشین گوئی فرمائی تھی وہ یہی حادثۂ اور فتنۂ

کبرای ہے، جو خلیفۂ ثالث کے عہد میں پیش آیا جس کے نتیجہ میں حضرت عثمان قتل ہو گئے
ان فتنوں کے ذیل میں آنحضرتؐ سے بطور خبر یہ نقل کیا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ "میرے
بعد فتنے رونما ہونے والے ہیں۔ اور جو شخص ان فتنوں میں بیٹھا رہیگا وہ کھڑے آدمی سے
اور کھڑا دوڑتے ہوئے سے بہتر ہے" اس کے علاوہ جنگِ جمل کے وقوع اور صفین
و نہروان کے واقعات کو بھی بیان کیا۔ اس ضمن میں یہاں تک فرمادیا کہ "میری فلاں بیوی
کے گھر سے اسلام کی مخالفت کے سلسلہ میں شیطان کے سینگ برآمد ہوں گے" مزید
برآں یہ کہ "میری اس بیوی کو چشمۂ حوءب کے کتے بھونکیں گے" (مسند احمد بن حنبل جلد ۲
ص ۲۳ و ص ۵۲) جنگِ صفین میں عمار یاسر شہید ہوئے۔ ان کی شہادت کے متعلق بیان
کیا کہ "اے عمار! تجھے باغی گروہ قتل کریگا، تو انھیں جنت کی طرف بلائے گا مگر وہ تجھے
جہنم کی دعوت دے گا" اسی طرح کربلا کے حادثۂ فاجعہ کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے
آنحضرتؐ نے اپنے صحابہ کو خبر دی کہ "میرے دین کی تباہی بنوامیہ کے ایک چھوکرے
کے ہاتھوں ہوگی، جس کا نام یزید ہے اور میرا بیٹا حسینؑ بے یار و مددگار اور پیاسا مع
اپنے اعزہ و اقارب کے کربلا کے میدان میں نہایت بے دردی سے شہید ہوگا"
مختصر یہ کہ اس طرح کی بہت سی پیشین گوئیاں مثلاً خروجِ دجال۔ آمدِ عیسیٰؑ۔ ظہورِ
مہدیؑ۔ اسلام کی آئندہ حالت۔ اسلامی حکومتوں کے واقعات اور مسلمان معاشرہ کی
پستی وغیرہ۔ غرضیکہ قیامت تک کے حالات، جن کو اخبار بالغیب اور معجزاتِ نبوت
کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے کتبِ سیر و احادیث میں موجود پائی جاتی ہیں۔ جن کو پڑھ لینے
کے بعد انسان کسی واضح راستہ کو اختیار کر سکتا ہے۔ مگر ہمیں تعجب ہوتا ہے جب ان اخبار و
[illegible] ابن سبا اور سبائیین کی فتنہ پروریوں اور خفیہ سازشوں کو لکھا ہوا نہیں پاتے۔ اگر اسلامی
[illegible]ست میں ابن سبا نے اتنا اہم کردار پیش کرنا تھا تو ضرور بالضرور آنحضرتؐ کسی نہ کسی مقام
[illegible]جمالاً یا تفصیلاً علانیہ یا اشارتاً اس بات کو بھی بطورِ خبر بیان کرتے، اور اپنے صحابہ کو

تنبیہہ کر دیتے کہ دیکھنا میرے بعد کے ہونے والے فتنے ایک نو وارد یہودی کی کارستانیوں کا نتیجہ ہوں گے۔ خبردار کہیں تم اُس کے دامِ فریب میں پھنس کر میری تعلیمات کو ہی نہ بھلا بیٹھنا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر ابنِ سبا ایسا مفسدِ اعظم کوئی ہوتا ہوتا تو آنحضرتؐ یقیناً اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ فرماتے۔ آنحضرتؐ کی تصریح کے بعد اور کوئی عمل کرتا یا نہ کرتا آنحضرتؐ کے مخلص شاگرد حضرت ابوذر و عمار یاسر اور امیر المومنینؑ ایسے جانثار ساتھی بالضرور عمل پیرا ہوتے۔ اور ابنِ سبا وغیرہ سے ضرور بیزاری اختیار کرتے۔ مگر جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے سیرت۔ تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں کوئی ایسی صراحت نہیں جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ ابن سبا وغیرہ سے ایسے ایسے کارنامے ظہور پذیر ہوں گے۔ لہٰذا نتیجۃً یہی ثابت ہوتا ہے کہ سبائی گروہ ایک وضعی اور خیالی داستان کا عنوان ہے۔

توضیح چہارم

زمانۂ فتنہ کی اہم شخصیتیں جن سے اس فتنہ کے واقعات مربوط ہیں وہ حضرت عائشہ۔ حضرت عثمان۔ حضرت طلحہ و زبیر۔ حضرت ابوذر۔ حضرت عمار یاسر وغیرہ ہیں۔ یا پھر حضرت امیر المومنینؑ علی بن ابی طالب علیہ السّلام کا وجودِ مبارک ہے ان فتنوں کے دور کے تمام واقعات اکثر و بیشتر انہیں بزرگوں سے متعلق ہیں۔ مخالفت اور دشمنی کی ساری تصریحات ان سے ہی منسوب ہیں۔ اور ان تمام لوگوں کے تھوڑے بہت بیانات روایات کی صورت میں تاریخوں اور حدیثوں میں پائے جاتے ہیں۔ مگر کسی مقام پر بھی یہ نہیں ملیگا کہ ان بزرگواروں میں سے کسی نے کسی بھی موقعہ پر خلوت میں جلوت میں یہ فرمایا ہو کہ ہم مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے والا یہ بدبخت ابنِ سبا یہودی ہے، اور ہم غیر شعوری طور پر اس کے جال میں پھنس گئے ہیں۔ حالانکہ مورخین نے اس حد تک مبالغہ آرائی سے کام لیا کہ ابنِ سبا، اور سبائی گروہ کے اثرات ساری مملکت اسلامیہ کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں موجود تھے۔ اور اس کے غیر اسلامی عقائد سے مسلمانوں کی اکثریت متاثر تھی۔ مورخین نے جو اس مقام پر حیرت انگیز تصویر کشی کی ہے اس کو پڑھنے سے رونگٹے

کھڑے ہو جاتے ہیں، اور تاریخ اسلام کا سطحی طور پر مطالعہ کرنے والا یقین کر لیتا ہے کہ ابن سبا پہلی صدی میں ایک عظیم شخصیت کا مالک ہوگا جس نے اتنا عظیم پارٹ ادا کر کے فتنوں کے دروازے کھول دیئے۔ ہم وثوق سے کہتے ہیں کہ اگر کوئی عبداللہ بن سبا اور سبائین ہوتے تو ضرور بر ضرور امہات المؤمنین یا صحابۂ رسولؐ جو اس وقت زندہ تھے کچھ نہ کچھ ابن سبا کے بارے میں بیان کرتے اور ان کا وہ بیان آج تاریخ میں بھی موجود ہوتا۔ اور نہیں تو حضرت امیر المؤمنینؑ کے کلام بلاغت نظام یعنی نہج البلاغۃ جو حضرت کے خطبات و مکتوبات کا مجموعہ ہے میں یقیناً ابن سبا کا تھوڑا بہت ذکر ہوتا۔ مگر ہمارے شکوک مبدل بہ یقین ہو جاتے ہیں جب ہم نہج البلاغۃ میں اس قسم کی کوئی صراحت نہیں دیکھ پاتے۔ حالانکہ نہج البلاغۃ میں اکثر و بیشتر عنوان پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد کے واقعات سابقہ خلافتوں پر تبصرہ۔ اپنے حقوق کا ذکر قتل عثمان کا پس منظر اور اس سے متعلقہ باتیں۔ جنگ جمل کے علل و اسباب اور معرکۂ صفین و نہروان کے وجوہات اور نتائج وغیرہ کے ہیں، اور بصراحت پائے جاتے ہیں۔ حالانکہ ابن سبا کے تذکرہ نویسوں نے انہیں واقعات میں اکثر کے متعلق سبائیوں کا اہم کردار بیان کیا ہے۔ اگر ابن سبا کا کوئی وجود ہوتا تو یقیناً امیر المؤمنینؑ کے کلام سے کہیں نہ کہیں اس کی مذمت یا مدح کا اظہار ہوتا، اور اس کو فسادات کا بانی قرار دیا گیا ہوتا۔

توضیح پنجم الزام تراشنے والوں نے جہاں حضرت ابوذر غفاری و عمار یاسر وغیرہ اصحاب رسولؐ پر سبائیت کا الزام لگایا اور لکھا کہ جناب ابوذر کا اشتراکیت کی طرف دعوت دینا ابن سبا کی تعلیمات کا ہی نتیجہ تھا، وہاں مالک اشتر۔ صعصعہ بن صوحان۔ محمد ابن ابوبکر۔ عمرو ابن الحمق۔ حجر بن عدی الکندی۔ زید بن صوحان وغیرہ مقدس مومنین اور جانثاران حضرت امیر المؤمنینؑ کو بھی معاف نہیں کیا۔ اور کہا کہ یہ سب کے سب فسادیوں کے سرغنے تھے۔ حالانکہ یہ تمام بزرگوار پیغمبر اسلامؐ کے صحابیوں میں شامل تھے۔ ہم نے

اپنے سابقہ بیانات میں ان تمام مقدس مومنین کے دینی وسیاسی کردار کو کتب رجال اور تاریخ سے پیش کر دیا ہے کہ یہ حضرات سبائیت سے کوسوں دور اور اپنے زمانہ کے مشہور زاہد۔ عبادت گذار اور پرہیز گار انسان تھے۔ ان بزرگوں کو محض اس لئے گوسبائی جاتا ہے کہ یہ سارے کے سارے حضرت امیر المومنینؑ کے جانثار۔ مخلص اور دوست و بازو تھے۔ اگر ان کا کردار ایسا ہی ہوتا جیسا کہ مورخین نے بیان کیا ہے تو ہم یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ حضرت امیر المومنینؑ علیہ السلام ان سے بیزار رہتے۔ اور انھیں باریابی کا شرف ہرگز نہ دیتے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے متعلق امیر المومنینؑ مدحیہ کلمات فرماتے نظر آتے ہیں۔ اور ہر ایک کی جدائی اور وفات پر امیر المومنینؑ نے قلبی افسوس ظاہر کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابن سبا اور سبائی گروہ افترا پرداز ذہن اور کذب و بہتان والے قلب کی پیداوار ہے۔ کیونکہ اگر مورخین کے بیانات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو قطع نظر اس کے کہ ان لوگوں کے حالات کیسے تھے خود حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے کردار اور دینی پوزیشن پر بھی ضرب کاری لگتی ہے، کیونکہ اگر امیر المومنینؑ نے ایسے سبائیوں کو اپنے ساتھ رکھا تو گویا فسادیوں اور فتنہ پروروں کی سرپرستی سلئے رکھی۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

توضیح ششم سب سے زیادہ وزنی اور قابل توجہ بات جو یہاں پیش کرنے کے قابل اور ابن سبا کے عدم وجود پہ دلیل ہے وہ یہ ہے کہ آخر کیا وجہ تھی جن لوگوں نے حضرت عثمان کی سیاست اور عمال حکومت کے افعال و کردار پر تھوڑی بہت بھی تنقید کی ان کے خلاف فوراً حکومت وقت کی طرف سے سخت سے سخت ایکشن لیا گیا، اور یہ پرواہ نہ کی گئی کہ تنقید کرنے والا کوئی جلیل القدر صحابی ہے یا زاہد و پرہیزگار مومن۔ حکومت کے مخالفین کو یا تو مارا گیا یا پھر جلاوطن کر دیا گیا۔ اس سلسلہ میں عبداللہ

97

عبداللہ بن سبا

مؤلفہ

جناب عمدۃ المحققین سید منظور حسین صاحب بخاری

مؤلف "توثیق فدک" "اسلام کا تاریک دور"

اجنالہ، سرگودھا

ناشر

مکتبۃ الناصر بیرون شاہ عالمی دروازہ، سرکلر روڈ، لاہور